

Scanned with CamScanner

ہم نے جو دیپ جلائے ہیں

صبح کی ہلکی روشنی افق پر پھیلنے لگی تھی۔ خاصہ پہاڑیاں سورج کی اولین کرنوں سے روشن ہوتے آسمان کے نیلگوں سائے میں خاموش کھڑی تھیں۔ ان کی ڈھلوانوں پر اگے ہوئے خودرو جھاڑ

مکمل ناول



جھنکار، کانٹے دار کیکر، ببول اور کہیں کہیں نیم کے درخت ہلکی بارش سے بھیگے ہوئے تھے۔ خشک مٹی کی مخصوص خوشبو ہوا میں گھلی ہوئی تھی۔ پہاڑیوں کے دامن میں پھیلے سنہری گھاس کے تنکے صبح کی ہوا سے آہستہ آہستہ جھوم رہے تھے۔

سڑک کے دونوں طرف رنگ برنگے سائن بورڈ صبح کی دھوپ میں چمکنے لگے تھے۔

مین بازار کی تنگ مگر مصروف گلیاں حسبِ معمول زندگی سے بھرپور تھیں۔

بازار کے ایک کونے میں نسبتاً پرانی دکانوں کی ایک قطار تھی۔ انہی میں آمنے سامنے دو دکانیں تھیں۔ ایک دکان پر وقت کی گرد جم چکی تھی، لکڑی کا پرانا کاؤنٹر اور دھندلاتے رنگ و روغن والی بے رونق دیواریں اس کے برسوں پرانے وجود کی گواہی دیتی تھیں۔ جبکہ اس کے عین سامنے واقع ایک چھوٹی سی دکان، محدود وسائل کے باوجود رنگوں، نفاست اور سلیقے سے جگمگا رہی تھی۔

شام ڈھلے، جب سورج اپنی آخری کرنیں سمیٹتا، نارتھ ناظم آباد کی فضا پر ہلکی سنہری چادر تن جاتی کہ اس شہر میں دن ہی نہیں راتیں بھی جاگتی تھیں۔ اسی بازار میں، انہی دو دکانوں کے درمیان، برسوں پرانی ایک کہانی خاموشی سے سانس لے رہی تھی۔

ایک طرف قنوت عبدالرزاق تھی،

اور دوسری طرف عکراش فہیم۔

دونوں کے درمیان فاصلہ چند قدموں کا تھا۔

مگر دلوں کے درمیان کھڑی ضد، انا اور ان کہے شکووں کی دیواریں شاید ان چھوٹی پہاڑیوں تو کیا، دنیا کے عظیم پہاڑوں سے بھی زیادہ بلند تھیں۔

☆☆☆

اس نے دکان کا شٹر اٹھانے کے لیے ہاتھ بڑھائے، مگر کسی اور ہاتھ نے نہایت سہولت سے اس کام کو لمحوں میں سرانجام دے دیا۔ قنوت مداخلت پر سیخ پا ہو کر پلٹی تھی۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے؟"

اس نے بگڑ کر سوال کیا۔

"بدتمیزی نہیں اسے لحاظ، مروت اور رواداری کے علاوہ مدد بھی کہہ سکتے ہیں۔"

وہ اب بے نیازی سے اپنے والدِ بزرگوار کی پرانی دکان کی طرف پلٹنے لگا تھا۔ وہ تلملا کر اس کے راستے میں حائل ہوگئی۔ اس نے گھور کر دیکھا۔

"کیا تمہیں احساس ہے ہم بیچ بازار میں کھڑے ہیں؟ تمہاری ایسی حرکتوں سے لوگ سو سو کہانیاں بنا لیں گے۔ مجھے یہاں کام کرنا ہے۔ اور میں کسی کی مدد کے بغیر اپنا کام کرنا چاہتی ہوں۔"

ویسے بھی وہ تند خو اور نازک مزاج تو تھی ہی، مگر اس وقت گویا اس کی آنکھیں غضب سے سرپر آ گئی تھیں۔

"لوگوں کے پاس کہانیاں بنانے کے لیے موضوعات کی کمی کب سے ہونے لگی؟"

اس نے شانے اچکاتے ہوئے کہا۔ "اور جہاں تک تمہاری مدد کا سوال ہے تو اطمینان رکھو، میں نے تم پر کوئی احسان نہیں جتایا۔"

وہ صلح جو انداز میں بول رہا تھا۔

"مجھے تمہاری صفائیاں نہیں چاہئیں۔ آئندہ میرے کسی کام میں مداخلت کرنے کی ضرورت نہیں۔"

عکراش کی آنکھوں میں نہ خفگی تھی نہ طیش، بلکہ ایک عجیب سی متانت تھی۔

"مدد مداخلت نہیں ہوتی۔ اور ہر تعلق بدنامی کا باعث نہیں بنتا۔ کچھ رشتے صرف انسانیت کے بھی ہوتے ہیں۔ لوگوں سے ڈرنا چھوڑ دو۔ بس خوف خدا رکھو۔"

وہ اس کا ناصحانہ انداز کیوں کر برداشت کرتی؟

"اور مجھے ایسی انسانیت کی ضرورت نہیں جو لوگوں کی زبانوں کا موضوع بن جائے۔ اور یہاں کوئی کسی کا بنا مطلب ساتھ نہیں دیتا۔"

اس نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ سر ہلایا۔

"تم واقعی عجیب ہو۔ تنہا سارا بوجھ اٹھانا چاہتی ہو اور پھر دنیا سے شکوہ بھی کرتی ہو کہ کوئی ساتھ نہیں دیتا۔ اور مجھے مطلبی بھی کہہ دیا۔ بہت

خوب۔"

قنوت نے کچھ کہنے کے لیے لب وا کیے پھر رک گئی۔ اس کے الفاظ جیسے حلق میں اٹک کر رہ گئے تھے۔ یہی تھا جو اس کا مخالف تھا۔

"بات ساتھ دینے کی نہیں، بات یہ ہے کہ کچھ فاصلے قائم رہیں تو خودداری محفوظ رہتی ہے۔"

وہ چند لمحے خاموش رہا، پھر اس کی طرف دیکھے بغیر سر ہلایا۔

"فاصلے اگر خودداری بچاتے ہیں، تو دیواریں دلوں کو ویران بھی کر دیتی ہیں۔ بہرحال، بے فکر رہو۔ آئندہ تمہارے کسی کام میں مداخلت کرنے کی جسارت نہیں کروں گا۔"

وہ اپنے والد کی دکان کی جانب بڑھ گیا۔

اور قنوت عبدالرزاق بے اختیار اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہ گئی۔

دل کے کسی گوشے میں ایک انجان سی خلش نے سر اٹھا لیا تھا۔ یہ تو روز کا معمول تھا وہ اس کی مدد کے لیے آگے بڑھتا تھا اور وہ اسے جھڑک دیتی تھی۔

☆☆☆

وہ اپنے والد کی قدیم اور بے رنگ و روغن دکان میں والد کے حکم پر لکڑی کے بوسیدہ کاؤنٹر پر جمی گرد صاف کرتے ہوئے جھنجھلا رہا تھا۔ نگاہ بار بار سامنے اٹھ جاتی۔ قنوت کا مددگار چودہ پندرہ سال کا نوید نام کا لڑکا بھی دکان پر آ گیا تھا۔ وہ اس سے کاؤنٹر صاف کروا رہی تھی۔ خود شیلف کی جھاڑ پونچھ پر لگی تھی۔ لڑکیاں فطرتاً نفاست پسند ہوتی ہیں اور باذوق بھی۔ اس کی حسِ لطیف کا کمال تھا کہ اس نے اس چھوٹی سی دکان کو سجا سنوار دیا تھا۔ بچے اب زیادہ تر وہیں کا رخ کرتے تھے۔ اس کے والد کی بڑی اور پرانی دکان گاہکوں سے خالی رہتی تھی۔

اس نے اسٹیشنری کے علاوہ بچوں کے مرغوب پاپڑ، چپس اور کینڈیز، چاکلیٹس بھی بچوں کو متوجہ کرنے کے لیے رکھ لی تھیں۔ رنگوں اور ڈرائنگز کا اسٹاک بھی نیا تھا۔ بچے کلر پینسل لینے آتے اور ساتھ دوسرے بیسیوں طرح کے کارڈز اور بک مارک، کی چین جیسی چیزوں میں سے بھی کچھ نہ کچھ ضرور خرید لیتے تھے۔ محض چھ سات ماہ میں اس نے دکان کا نقشہ ہی نہیں قسمت بھی بدل دی تھی۔

اس نے سامنے والی دیوار پر خود کارٹون کریکٹر پینٹ کیا تھا۔ سب سے زیادہ تو وہ ہی بچوں کے لیے کشش کا باعث تھا۔ اسے پینٹ کرتا دیکھ کر کتنے ہی لوگ رک جاتے تھے۔ عکراش نے بہت صبر و برداشت کا مظاہرہ کیا تھا ورنہ ایک دو کی تو ضرور ٹھکائی ہو جاتی بس اس نے اس کی دکان کے سامنے کرسی ڈال لی تھی اور یہیں سے لوگوں کو گھورتا نظروں کے زاویے بدلنے پر مجبور کر گیا تھا۔ جبکہ قنوت کو اس کے اقدام نے بھڑکا دیا تھا۔

"تم میرے گارڈ نہیں ہو۔ ہٹاؤ یہاں سے اپنی شاہی کرسی۔"

وہ کرسی کی بدحال حالت پر چوٹ کرتے ہوئے بولی تھی۔ فہیم چچا بھی پکے بنیے تھے۔ ایک پیسہ دکان کی تزئین و آرائش پر خرچ نہیں کرتے تھے۔ سات آٹھ سال پہلے عکراش نے باپ سے کہا تھا دکان میں رنگ و روغن کروا دیں مگر نہیں بھئی جو جیسا چل رہا ہے ویسا چلتا رہے، انہیں بس پیسے جمع کرنے سے مطلب تھا، خرچ کرنے سے پرہیز کرتے تھے۔ وہ بچپن سے اپنے گھر اور دکان کی حالت زار پر کڑھتا رہا تھا اور اب یہ کڑھن زیادہ بڑھ گئی تھی۔ بازار میں سب کی دکانیں نئی طرزِ تعمیر کی وجہ سے نمایاں تھیں سوائے چند چھوٹی دکانوں کے جیسے قنوت کی دکان اور اب اس کا حلیہ قنوت نے اپنی عقل مندی سے بدل دیا تھا۔ کم خرچ بالا نشیں کی وہ عملی تفسیر بنی ہوئی تھی۔

"اس لڑکی کی ضد صرف مجھ سے ہے۔ میری

ضد میں اس دکان کا چارج سنبھالا ہے۔ قیوم بھائی کی ٹانگ ہی ٹوٹی ہے وہ دکان پر آ کر بیٹھ سکتے ہیں ابھی نہیں تو کچھ دنوں بعد سہی اور یہ لڑکا نوید ان کی مدد کر دیتا۔ مگر نہیں اسے بھی ضد ہے۔"

اس نے دانت پیسے۔

"کیا ہوا کیوں جل کڑھ رہے ہو؟"

اس کے والد صاحب اس کے مزاج شناس تھے۔

"آپ اس دکان کی حالت زار پر بھی توجہ دیں۔ ورنہ کچھ دنوں میں بند کرنی پڑ جائے گی۔"

"سب اپنے نصیب کا کھاتے ہیں۔ اس بچی کی محنت ہے۔ دیکھو تم سے تو اچھی ہے کیسے دل لگا کر کام کر رہی ہے۔"

وہ تڑپ ہی گیا۔

"میں ایم کام کر کے اس دکان پر بیٹھوں؟ کبھی نہیں، مجھے ملک سے باہر جانا ہے۔ ویسے بھی یہاں رکھا کیا ہے۔ بھوک افلاس، بدحالی اور روز کے ایکسیڈنٹ، قیوم بھائی اس جوانی میں معذور ہو گئے۔ اس وحشی ٹرالر تلے ان کی ٹانگ کچلی گئی۔ کون کسی کا گریبان پکڑ سکا؟ اگر وہ مر بھی جاتے تو کسی کو فرق نہ پڑتا۔ اپنے خاندان کے واحد کفیل آج معذور ہو کر گھر والوں کے لیے بوجھ بن گئے کل کو اگر ایسا ہی میرے ساتھ ہوا؟"

اس کی جذباتی تقریر نے فہیم صاحب کا دل دہلا دیا۔

"عکراش! سوچ سمجھ کر بولو۔ حادثہ تھا ہو گیا۔ قسمت کا لکھا کون ٹال سکتا ہے۔ شکر ہے جان بچ گئی۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ تم ملک چھوڑ جانے کی باتیں کرو۔"

اس نے سر جھٹکا۔

"مجھے اپنی جان پیاری ہے۔ کچھ سالوں بعد میں آپ سب کو بھی یہاں سے لے جاؤں گا۔ اور یہ لڑکی اس کی عقل بھی ٹھکانے آ جائے گی۔ قیوم بھائی بھی خلاف تھے مگر اسے بہت شوق تھا یہاں آ کر دکان چمکانے کا۔ یس بے بی آئی ایم سیلر۔"

وہ اپنے دوست اقبال کو، اس کے دس سالہ بھتیجے کے ساتھ اس دکان کا رخ کرتے دیکھ کر مزید جل گیا۔

"کیوں الجھتے ہو اس سے؟ جانتے بھی ہو اس بچی کی لڑائی تم سے نہیں، حالات سے ہے۔"

فہیم صاحب شیلف میں چیزیں درست کرتے ہوئے ان کی نوک جھونک بھی ملاحظہ فرما چکے تھے۔

کچھ کسٹمرز اس طرف بھی آ گئے تھے۔ فہیم صاحب ان کی طرف متوجہ ہو گئے۔ مگر اس کی نگاہیں وہیں مرکوز تھیں۔

اقبال نے بھتیجے کو ڈھیر ساری الم غلم چیزیں دلوا دی تھیں۔ وہ جانتا تھا۔ اقبال، قنوت کو پسند کرتا ہے۔ اس نے خود کہا تھا، تم انکار کر چکے ہو تو اب میں اپنا رشتہ بھجوا دیتا ہوں، اور اس دن اس نے اقبال سے دوستی ختم کر لی تھی، مگر اس سے قبل اس نے اقبال کو کیا نہیں کہا تھا۔

"تم آستین کا سانپ ہو۔ دوست کی پشت پر وار کرنا چاہتے ہو۔ قنوت میری بچپن کی منگیتر ہے۔"

اور اقبال تلملا گیا تھا۔

"وہ یہ منگنی ختم کرنے کا اعلان کر چکی ہے۔"

اس کے پاس الفاظ نہیں تھے اپنے دفاع کے لیے مگر وہ [illegible] رہا تھا۔

"[illegible] نظار میں تھے۔ تمہارے جیسے دوست سے بہتر ہے انسان۔"

اقبال رکا نہیں تھا اپنے منہ پر یہ سب کیسے سن لیتا؟ بچپن کی دوستی اور لحاظ مانع تھا، ورنہ اقبال ان الزامات پر ہاتھ بھی اٹھا لیتا۔ قنوت سب سے مسکرا کر بات کرتی تھی۔ عکراش کے اندر آگ بھڑک رہی تھی۔

وہ حالات سے ہارا ہوا نہیں تھا وہ بدظن تھا۔ کہیں کوئی بہتری کی امید جو نظر نہیں آتی

تھی۔سامنے والی دکان پر رش بڑھ چکا تھا۔اس لڑکی کی زندگی یقیناً بہتری کی جانب گامزن تھی۔اسکول یونیفارم میں ملبوس بچے اپنے والدین کے ساتھ اسی دکان کی طرف جاتے تھے۔وہ اکتا گیا۔اسے یہاں آنے میں کبھی کوئی دلچسپی نہیں تھی۔اسکول کے زمانے میں فہیم صاحب زور زبردستی سے لے آتے تھے مگر اسکول کے بعد وہ اس دکان پر بیٹھنا اپنی شان کے خلاف ہی سمجھنے لگا تھا۔اب بھی نہ آتا اگر یہ لڑکی اپنے حالات سے مردانہ وار لڑنے کا فیصلہ نہ کرتی۔اس کا دل ہر چیز سے اچاٹ ہوگیا۔

☆☆☆

عکراش جذباتی،خود پسند،من مانی کرنے والا تھا۔وہ اس پر پابندیاں بھی لگاتا تھا۔اسکول تک تو وہ اس سے ڈرتی تھی۔بچپن سے نسبت طے تھی۔فہیم چچا اس کے والد کے اچھے دوست تھے اور دوستی کو رشتے داری میں بدلنے کا خیال بھی فہیم چچا اور ان کی بیوی نعیمہ چچی کا تھا۔اس نے تو ہمیشہ ہی اپنے ساتھ عکراش کا نام سنا تھا۔ابو کا انتقال ہوا تو پانچویں جماعت میں تھی۔

ان کے انتقال کے بعد پہلی برسی سے قبل چچی نے باقاعدہ اس کا رشتہ مانگا اور امی اور بھائی کی طرف سے اقرار ہوتے ہی نعیمہ چچی نے اس کی کلائی میں اپنے طلائی کنگن پہنا دیے۔اس وقت زمانے نعیمہ چچی کے وہ ڈھیلے ڈھالے کنگن اتار کر سنبھال کر صندوق میں رکھ دیے تھے۔مگر بڑے ہونے کے ساتھ وہ کنگن،کبھی تو اس کے تصور میں کھنکناتے چھنکتے اور کبھی اس منہ زور کے سخت رویے کے سبب زنجیریں لگنے لگتے۔وہ بھی تو دھوپ چھاؤں جیسا مزاج رکھتا تھا۔خیال بھی رکھتا مگر رعب زیادہ جماتا۔

وہ تھرڈ ایئر میں تھی جب،اس کی کالج کی سہیلی اس کی منگنی سے لاعلمی کی وجہ سے ہی اس کے لیے اپنے بھائی کا رشتہ لے آئی تھی۔قنوت بھی اس کے ارادوں سے بے خبر تھی۔ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ کوئی اس کا سوالی بن کر آیا تھا۔عالیہ کے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے۔بیٹی کی بے عقلی پر بھی غصہ آیا سہیلی کو پہلے کیوں نہ بتایا اور گھر تک کا پتا دے دیا۔نعیمہ چچی کی آمد بھی غیر متوقع تھی۔وہ بھی آنے والوں کا،سوال سن کر ہکا بکا تھیں۔

زوبیہ بھابھی نے بات سنبھالی۔

"یہ شرمیلی سی ہے اس لیے نہیں بتایا۔اس کی منگنی تو بچپن میں ہی ہوگئی تھی۔نعیمہ چچی کا بیٹا ہے۔ساس ہیں یہ قنوت کی۔"

بھابھی نے تعارف کروایا۔سدرہ کی والدہ پھر نہیں بیٹھیں۔سدرہ بیچاری الگ معذرت کر رہی تھی۔عالیہ شرمندہ تھیں۔

چچی کی پیشانی پر بھی بل پڑ گئے۔انہوں نے گھر جاتے ہی ساری روداد دونوں بیٹیوں اور بیٹے کو سنا دی۔اس واقعے کے بعد وہ مزید پابندیاں عائد کرنے لگا۔

"کوئی ضرورت نہیں ہے کسی لڑکی سے زیادہ دوستی کرنے کی۔"

دوسرے دن کالج کے راستے میں اسے دانت پیس کر تنبیہ کی۔

چچی اس کی انگلی میں اسی شام انگوٹھی بھی ڈال گئیں۔وہ تو نکاح کا کہہ رہی تھیں اور تب ہی یہ حادثہ ہوگیا۔قیوم بھائی کی معذوری نے ان کے گھر کی بنیادیں ہلا دیں۔بھابھی کی مسکراہٹ نے دم توڑ دیا۔بھائی کے دونوں بچے چھوٹے تھے۔اور امی نے گھر داری سے آگے کبھی کچھ کیا ہی نہیں تھا۔دکان جس سے گھر کا چولہا جلتا تھا۔اس کی ذمہ داری بھائی نے عکراش کو دینی چاہی تھی مگر وہ باپ کی دکان پر نہیں بیٹھتا تھا۔۔سالے کی دکان کیوں سنبھالتا؟اس نے دکان کو کرائے پر چڑھانے کا مشورہ دیا اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہ تھا۔بھائی کی ٹانگ کٹ چکی تھی۔ریڑھ کی ہڈی میں بھی نقص آگیا تھا۔ان کے دو آپریشن ہوئے

اور ساری جمع پونجی اٹھ گئی وہ چل تو نہیں سکتے تھے مگر اب اٹھ کر بیٹھنے کے قابل ہو گئے تھے۔ ڈاکٹر نے کہا تھا مزید ایک اور آپریشن کے بعد مصنوعی ٹانگ لگائی جا سکتی ہے، مگر اس کے اخراجات بہت زیادہ تھے۔ وہ سب اس گورکھ دھندے میں پھنسے تھے اور کرائے دار دکان ہڑپ کرنے کے چکر میں تھا۔

دکان تو ان کے ہاتھ سے نکلنے سے بچ گئی۔ مگر جب دوبارہ کرائے پر دینے کی بات آئی تو وہ اڑ گئی۔

''آپ کے علاج کے لیے پہلے جمع پونجی اٹھی پھر بھابھی کا سارا زیور بھی بک گیا، اب میرے لیے بنائے زیور کی باری ہے۔ وہ بکے گا اور دکان میں سامان آئے گا۔ جب تک آپ کی مصنوعی ٹانگ نہیں لگتی آپ کوئی مشقت نہیں کریں گے۔ میں بیٹھوں گی دکان میں۔ مجھے آپ بہن نہیں اپنا بھائی سمجھیں۔"

مگر قیوم بھائی راضی نہیں ہوئے۔ وہ بھی اڑیل تھی۔

اس کے ارادوں کی خبر پڑوس کے گھر یعنی اس کے سسرال تک جا پہنچی۔

امی نے ہی نعیمہ چچی کو بلا کر کہا تھا، "اسے سمجھائیں بلکہ نکاح کر کے لے جائیں۔ مشکل سے بالی، چین اور نتھ بنوائی تھی اس کے لیے، دو ڈھائی لاکھ کی مالیت ہوگی اور یہ بیچنے پر بضد ہے۔ خالی ہاتھ تو نہیں رخصت کر سکتی اسے۔"

امی رونے لگی تھیں۔ نعیمہ چچی بھی ان کے حالات سے واقف تھیں۔

گھر جاتے ہی اپنے بیٹے سے فقط سادگی سے نکاح اور رخصتی کی بات کی تھی انہوں نے۔ وہ ہتھے سے اکھڑ گیا۔

"ایسے کیسے نکاح۔ میری نوکری تک لگی نہیں ہے۔ اور میں اس کباڑ خانے میں شادی کر کے اپنی بیوی کو لے کر آؤں گا؟ کبھی بھی نہیں۔ ابا اس گھر کی مرمت تک نہیں کرواتے۔ اور مجھے ابھی شادی کرنی ہی نہیں ہے۔ دو چار سال باہر کے ملک جا کر کماؤں گا پھر نکاح کر کے وہیں قنوت کو لے جاؤں گا۔ مجھے اس اندھیر نگری چوپٹ راج میں نہیں رہنا۔ جہاں قابلیت کی قدر نہیں۔"

وہ نہیں مانا تھا۔ قنوت کا راستہ آسان ہو گیا۔ اس نے بھابھی اور فہیم چچا کو اپنا حامی بنا لیا۔ سارا سامان فہیم چچا سے ادھار رقم لے کر ڈلوایا تھا۔ امی تو زیورات اس کے حوالے کرنے پر آمادہ نہیں تھیں۔ سب کام بالا ہی بالا ہوئے۔ فہیم چچا کی طرف سے اسے مکمل رہنمائی اور سپورٹ ملی تھی۔

"ایسے کیسے وہ دکان چلائے گی؟ ہزار طرح کے لوگ دکان پر آتے ہیں۔ آپ اسے سمجھائیں۔ اسے شہ مت دیں۔"

وہ باپ سے الجھنے لگا۔

"ٹھیک کہتا ہے عکاش، لڑکی ذات یہ کام کرتی کیا اچھی لگے گی؟"

ماں بھی اس کی ہم خیال تھیں۔

"لڑکی ہے تو کیا ہوا؟ اس میں ہمت و حوصلہ ہے۔ اور دکان چلانا کون سا مشکل ہے۔"

فہیم صاحب نے کسی بات کو اہمیت نہیں دی۔

"اسے کہیں اسکول کی جاب کر لے۔ یا پھر کوئی اور ڈھنگ کا کام مگر یہ۔"

نعیمہ سیخ پا تھیں۔

"صاف کہہ رہا ہوں میں اگر اس نے یہ انوکھا خیال دل و دماغ سے نہیں نکالا تو میں اس سے شادی نہیں کروں گا۔"

وہ اعلان کر کے باہر چلا گیا۔ فہیم صاحب نے سر جھٹکا۔ نعیمہ نے سکون کی سانس لی۔ یہ دھمکی کارگر ثابت ہو سکتی تھی۔ انہوں نے جوں کے توں اس کے الفاظ عالیہ کے سامنے دھرا دیے۔ وہ دہل کر رہ گئیں۔

وہ اندر کمرے میں سنتی رہی۔ امی نے ان

کے جانے کے بعد اسے بے نقط کی سنائیں۔
"کیوں اپنے مستقبل کی دشمن بن رہی ہے؟ اتنا اچھا لڑکا۔ مثالی خاندان۔ منگنی بھی برسوں پرانی اگر یہ منگنی ٹوٹ گئی تو کون سا اچھا رشتہ مل جائے گا؟"

اس نے بحث نہیں کی۔ لب سیے بیٹھی رہی۔ امی یہی سمجھی تھیں وہ ارادہ بدل چکی ہے۔ مگر ایسا نہیں تھا۔ دوسرے دن وہ پہلی بار دکان پر جا رہی تھی اسے بھائی اور امی کی ناراضی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ وہ ہی دنیا کے ڈراوے، اندیشے خدشات۔

"حق حلال کمانا گناہ نہیں ہے۔"

وہ خبر ہونے پر دندناتا ہوا آیا تھا۔

"چلو یہاں سے۔"

اس نے بڑے حق سے قنوت کی کلائی پکڑی تھی۔

"دماغ تو ٹھیک ہے تمہارا؟"

وہ جو کبھی آپ جناب اور "جی ٹھیک ہے" سے آگے نہیں بڑھتی تھی۔ اس وقت چمک کر مستفسر ہوئی تھی۔ اس نے قنوت کی کلائی جھٹکی۔

"تم گھر چلو وہیں بات ہوگی تم سے۔"

وہ بھی غرایا تھا۔

کتنے ہی راہ گیر رک گئے۔ چچا اپنی دکان کا کاؤنٹر چھوٹے بیٹے فضل کے حوالے کر کے ان کے سر پر پہنچے تھے۔

"عکراش! یہ کیا طریقہ ہے؟"

وہ بیٹے کی شعلہ مزاجی سے واقف تھے۔

"آپ سب جانتے ہیں یہ کیا ہے۔ آپ کی شہ پر یہ یہاں، اس دکان پر دکان داری کرنے آئی ہے۔ آپ بتائیں پورے بازار میں کوئی سیلز گرل موجود ہے؟ یا کوئی لڑکی شاپ کیپر ہے؟ کوئی لڑکی یہ کام کیسے کر سکتی ہے؟"

اس کی غیرت کو جوش آیا ہوا تھا۔

"کوئی نہ کرے یہ کام مگر میں اپنی دکان خود چلاؤں گی۔ تم یا کوئی بھی میرے آڑے نہیں آ سکتا۔"

وہ بھی بہادر بنی اس کی آنکھوں میں دیکھ کر بولی تھی۔

"کبھی نہیں۔ مت بھولو تم، میری منگیتر ہو اور میں ہرگز برداشت نہیں کروں گا کہ میری منگیتر ایسا کام کرے جو میری عزت کے منافی ہو۔"

اسے کسی نے کھولتے لاوے میں دھکیل دیا تھا۔

"اپنی زبان سنبھال کر بات کرو۔"

فہیم چچا بیٹے پر گرجے تھے۔

"آج اگر یہ یہاں سے نہیں گئی تو میں ہر تعلق توڑ دوں گا۔ سمجھا دیں اسے۔"

وہ پتا نہیں کس برتے پر یہ کہہ گیا؟

"توڑ دو مجھے بھی پروا نہیں۔"

لوگوں کا مجمع لگ چکا تھا۔ اس نے قنوت کی دیدہ دلیری پر دانت پیسے۔

"قنوت! گھر چلو۔"

وہ دھاڑا تھا۔ وہ جانتی تھی اگر آج دب گئی تو کبھی سر نہیں اٹھا سکے گی۔ وہ اپنی جگہ سے نہیں ہلی۔

"میں کہہ رہا ہوں اگر تم نے اپنی ضد نہیں چھوڑی تو تم سے شادی نہیں کروں گا۔"

اس نے دھمکی دی۔ قنوت نے ہاتھ اس کی گرفت سے کھینچا۔ انگوٹھی اتار کر چچا کو دے دی۔ وہ خاموش تھی۔ چچا نے بھی کچھ نہ کہا۔ عکراش کا بس چلتا تو اس کی گردن دبا دیتا۔ مگر وہ تیز قدموں سے اس جم غفیر کو چیرتا نکل گیا۔

"جاؤ بھئی سب اپنا کام کرو۔ اور فرمان، اکبر، بلال یہ بچی عبدالرزاق کی بیٹی ہے۔ میرے دوست کی بیٹی۔ میری بھتیجی ہے۔ تم سب اس کے لیے چچا اور بھائی کی طرح ہو۔ خبردار جو اپنی زبانوں سے اس کے خلاف کچھ کہا۔ اپنے ذہن صاف کر لو۔ یہ عزت دار گھرانے کی بچی ہے اسے اس کا کام کرنے دو۔ یہ بھائی کا بازو بننا چاہتی

ہے۔ اپنے خاندان کے لیے حق حلال کی روزی کمانا چاہتی ہے، تم سب سمجھ گئے ہوناں جو میں کہنا چاہتا ہوں۔"

فہیم چچا نے اردگرد کے دکان داروں کو تنبیہہ کرنا ضروری سمجھا۔

وہاں سب نے نگاہیں جھکالی تھیں۔ اس کی جانب پھر کسی نے انگلی نہیں اٹھائی مگر گھر میں سرد جنگ سی چھڑ گئی۔ منگنی کی انگوٹھی چچا کے حوالے کرنے کے اقدام نے اسے مزید امی کے غصے کا نشانہ بنایا۔ عکراش امی کی نظر میں ہمیشہ کی طرح درست تھا۔

وہ اسے اپنی ملکیت سمجھتا تھا۔ وہ اس سے چار سال بڑا تھا۔ اس پر رعب بھی جماتا تھا۔ بچپن میں وہ محلے کے بچوں کے ساتھ کھیلنے نکلتی تو ڈانٹ کر گھر میں بھیج دیتا تھا۔ وہ امی سے شکایت کرتی۔

"عکراش بھائی مجھے کھیلنے نہیں دیتے۔ سب بچے آنکھ مچولی کھیل رہے تھے اور وہ مجھے گھر لے آئے۔"

اس وقت تک تو وہ اسے بھائی ہی کہتی تھی۔

"تم محلے کے لڑکوں کے ساتھ مت کھیلا کرو۔ ثانیہ اور عارفہ بھی تو ہیں۔ گھر میں کھیلتی ہیں۔ عکراش بتا رہا تھا۔ اقبال کا بھائی انعام تمہیں کل گولا گنڈا دلا رہا تھا۔ منع کیا ہے ناں میں نے کسی سے کوئی چیز لینے سے۔ عکراش کو بھی اسی بات پر غصہ آیا تھا۔"

امی کے پاس پوری رپورٹ پہنچی ہوتی تھی۔ وہ بارہ سال کی بچی دل میں اس سے ناراض ہو جاتی تھی۔

"انعام بھائی تو سب بچوں کو گولا گنڈا دلوا رہے تھے۔ ان کی بہنیں بھی تو تھیں۔"

وہ ماں سے کہتی مگر امی نے کب اس کی بات کو سمجھا تھا۔ اسے جلد ہی گھر بٹھا لیا گیا۔ امی، عکراش کی سب سے بڑی حمایتی تھیں۔ اور پھر قیوم بھائی تھے۔ انہیں عکراش کبھی غلط نہیں لگتا تھا۔ اس نے کالج جانا شروع کیا تو وہ باڈی گارڈ بن گیا۔

وہ تلملاتی رہتی مگر کچھ کہہ نہیں سکتی تھی۔ یہ بھی تھا کہ اس کی موجودگی سے تحفظ کا احساس بھی ہوتا تھا۔ گرلز کالج کے سامنے اکثر شریر اور آوارہ لڑکوں کا ہجوم ہوتا۔ ایسے میں اس کی موجودگی تقویت کا باعث بنتی تھی۔ پھر وہ رشتے والی بات جس کا فسانہ بنا۔

سدرہ سے اس نے دوستی ختم کی تو عکراش کے کہنے پر۔ وہ اس سے بات نہیں کرتی تھی۔ وہ کچھ کہتا تو سن لیتی تھی۔ کچھ پوچھتا تو ہوں ہاں سے زیادہ جواب نہیں دیتی تھی۔

اور وہ سمجھتا تھا وہ اب بھی وہ ہی بارہ سال کی بچی ہے، جو اس کی شکایت کی وجہ سے گھر بیٹھ جائے گی۔ وہ اب بھی رعب جمانے سے باز نہیں آتا تھا۔ اور اب جب وہ منگنی کی انگوٹھی لوٹا چکی تھی۔ وہ پھر بھی اس کا سایہ بنا ہوا تھا۔ چچا کی دکان پر نہ بھٹکنے والا شام تک وہیں نظر آنے لگا تھا۔ مگر اس کے ارادے اٹل تھے۔

اس کا ذہن مختلف سوچوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ وہ گزرے سات ماہ میں چچا کا تھوڑا بہت قرض اتار چکی تھی۔ مگر بھائی کا علاج ابھی باقی تھا۔

ایک خاتون نے اس سے رجسٹر اور پین کی قیمت پوچھی تو وہ غلط رقم بتا بیٹھی۔

خسارے کے سودے کرنا تو اس کی پرانی عادت تھی۔

اس ننھی بچی نے چاکلیٹ مانگی تو اس نے چپس کا پیکٹ اٹھا کر کاونٹر پر رکھا۔

"بیٹی خیریت ہے؟ طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

اس کی دکان پر باقاعدہ آنے والی ایک عمر رسیدہ خاتون نے فکرمندی سے پوچھا۔

"بالکل ٹھیک ہوں۔"

اس نے مصنوعی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا، مگر خود اسے بھی احساس تھا کہ وہ ٹھیک نہیں تھی۔

☆☆☆

آج وہ بستر پر کروٹیں بدل رہی تھی۔ گھر کے حالات پہلے سے بہتر ہو رہے تھے۔ بھائی کا علاج بھی جاری تھا۔ ایک طرف دکان کی مرمت کی فکر تھی کہ اس کا اکھڑتا پلستر خطرناک ہو چکا تھا۔ مگر دل پر بوجھ اس کی مدد کے سبب تھا۔

وہ جانتی تھی وہ وہاں ہر وقت اس کے لیے ہی موجود تھا۔ اس نے کروٹ بدلی، دل سے صدا آئی وہ نہ ہوتا تو؟

وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

کس کی مجال تھی جو قنوت کی طرف نظر بھی اٹھا کر دیکھتا۔ کچھ دن پہلے، بازار میں وہ ایک راہ گیر کے ہونگ کرنے پر اسے سبق سکھا چکا تھا۔

اس کے بعد سب محتاط ہو گئے تھے۔ فہیم چچا تھے جن کی شفقت اور رہنمائی نے اسے اعتماد بخشا تھا اور وہ تھا جو مخالف تھا مگر اس کا محافظ بھی تھا۔ اقبال بھائی اور انعام بھائی جنہوں نے بر وقت کرائے دار دکان دار کی چیٹنگ سے باخبر کیا تھا جیسے اچھے انسان بھی دنیا میں موجود تھے۔ جو اکثر دل گیری کے لیے آتے رہتے تھے۔ مگر اس کے من پر عکراش نام کی چھاپ گہری تھی۔

اس شخص کے ساتھ زندگی دشوار ہو سکتی تھی۔ اسے اپنے گھر کی گرتی دیوار کو سہارا دینا تھا۔ اپنے بھائی کی حالت سے وہ واقف تھی۔ دونوں بچے اسکول جانے کے لائق ہو گئے تھے۔ دوسری طرف امی تھیں، جنہیں اس کی شادی کی فکر تھی۔

"عکراش تو ملک سے باہر جا رہا ہے۔ وہ تو راضی ہی نہیں ابھی شادی کے لیے۔ اقبال کی امی کئی رشتہ لے کر آئی تھیں۔ مگر کیسے ہاں کر دوں؟ برسوں کی منگنی، بات بڑوں کے بیچ ہوئی تھی۔"

وہ امی اور بھائی، بھابھی کے مکالمے بھی سن چکی تھی۔ رات کے کھانے کے وقت وہ اسے ہی سنا رہے تھے۔ نعیمہ چچی تو اس سے سخت ناراض تھیں۔ آتیں بھی تو اس سے بات نہیں کرتی تھیں۔ بس سلام کا جواب دے دیتی تھیں۔ عکراش کی چھوٹی بہنیں ثانیہ اور عارفہ کا رویہ نہیں بدلا تھا۔ وہ اس واقعے کا ذکر بھی نہیں کرتی تھیں۔ ثانیہ اس کی ہم عمر تھی۔ عارفہ سال بھر چھوٹی۔ اس نے سرکاری اسکول میں پڑھا تھا جبکہ چچا کی زیادہ اچھی آمدنی ہونے کے سبب فہیم چچا کے بچوں نے اچھے نجی اسکول میں تعلیم حاصل کی تھی۔ کالج بھی ان کے نسبتاً زیادہ فیس والے تھے۔ جبکہ قنوت وہ ہی گورنمنٹ کالج کی طالبہ تھی نے گریجویشن کیے بغیر تعلیم کو خیرباد کہہ دیا تھا۔

بھائی کے ایکسیڈنٹ کے بعد وہ فائنل ایئر کے پیپر بھی نہیں دے سکی تھی۔

زندگی بہت دشوار ہو گئی تھی۔ اور وہ آسانی کی آس لگائے ہر دشوار گزار راہ سے گزر جانے کا تہیہ کر چکی تھی۔

☆☆☆

دوسرے دن وہ کچھ جلدی دکان پر جانے کے لیے اٹھی تھی۔ اسے چھت کی مرمت کروانی تھی۔

اس نے جلدی جلدی گرم [illegible] حلق سے اتاری۔

"اتنی جلدی جا رہی ہو۔ آج تو اتوار ہے۔ بازار ذرا دیر سے کھلتا ہے۔ تم بھی تاخیر سے چلی جانا۔"

بھابھی نے امی کے اشارے پر اسے روکنا چاہا تھا۔ اقبال کے رشتے پر اس سے رائے لینے کا مشکل کام بھی زوبیہ بھابھی کو انجام دینا تھا۔ وہ اس کی فکروں، پریشانیوں سے واقف نہیں تھیں۔

"نہیں مجھے آج دکان کی میٹینس کروانی ہے۔ کچھ کام نکل آیا ہے۔"

اس نے صاف شفاف چہرے پر ماسک لگایا۔ چادر اوڑھی اور خدا حافظ کہہ کر باہر کی راہ لی۔ عالیہ دل مسوس کر رہ گئیں۔

"اس کی عمر کی لڑکیاں کیسی بے فکر زندگی گزار رہی ہیں۔ میری بچی گھر کی ذمہ داریوں کے بوجھ سے کملا کر رہ گئی۔ بس میں اس کی جلد از جلد شادی کر کے اسے اس مصائب بھری زندگی سے نکالنا چاہتی ہوں۔ رہی دکان کی بات تو وہاں میں بیٹھ جایا کروں گی۔ بس یہ ہاں کر دے شادی کے لیے۔"

بھابھی بھی اس کے عزم و حوصلے کی معترف تھیں۔

پر انہیں خدشہ لاحق تھا کہیں وہ عکراش کے لیے دل میں نرم گوشہ نہ رکھتی ہو۔ سانولی رنگت والا قد آور اور تیکھے مزاج کا مالک وہ لڑکا، نظر انداز کرنے کے قابل نہیں تھا۔ اقبال بھی اس سے کسی طور کم نہیں تھا مگر تعلق اور وابستگی کی بات یہاں نہیں تھی۔

"تم اس سے بات کرو۔ میں زندگی بھر اس اسے گھر بٹھا کر کمائی نہیں کرواؤں گی۔"

بھابھی نے بادل نخواستہ سر ہلایا۔

"پھر بھی آپ ایک بار نعیمہ چچی اور فہیم چچا سے بات کر لیں۔ کہیں بعد میں کوئی بدمزگی نہ ہو جائے۔"

ان کی بہو سمجھ دار تھی۔

☆☆☆

خاصہ کی پہاڑیاں دور سے ہی اس کے استقبال کرنے کے لیے ایستادہ نظر آتی تھیں۔ خاصہ ہلز اور نگی اور نارتھ ناظم آباد کے درمیان واقع، کراچی کی معروف پہاڑیوں میں سے ایک ہے۔ وہ آتے جاتے ہمیشہ ان پہاڑیوں پر نگاہ ڈالتی تھی۔ بچپن میں انہوں نے وہاں جا کر بہت کھیل بھی کھیلے۔ کچھ بڑے ہونے کے بعد وہاں جا کر خوب سیلفیاں بھی بنائیں، مگر اب تو سیر و تفریح کا تصور بھی زندگی سے عنقا ہو گیا تھا۔

وہ گلی کا موڑ آنے پر سر جھٹک کر آگے بڑھنے لگی۔ چھٹی والے دن صبح کے وقت معمول کی چہل پہل مفقود ہوتی تھی۔ مگر آج اسے زیادہ ہی خاموشی محسوس ہو رہی تھی۔ اس کے قدموں میں تیزی آ گئی۔ اور اچانک ہی کوئی اس کے سامنے آیا تھا۔ وہ ایک دم پیچھے ہٹی۔ اسے خوں نخوار نظروں سے گھورا۔

"کہاں جا رہی ہو اتنی عجلت میں؟"

وہ بلی شرٹ ٹراؤزرز پہنے بال نفاست سے سنوارے اس کے سامنے تھا۔

"تم سے مطلب؟"

وہ اسے سیدھا جواب نہ دینے کا سوچ چکی تھی۔

"قنوت! بہت برداشت کر رہا ہوں میں تمہاری زبان کی طراری کو۔"

وہ بھی اکھڑا ہوا سا تھا۔

"میرے راستے میں آنا چھوڑ دو، برداشت کرنے کی زحمت سے بچ جاؤ گے۔"

وہ ترکی بہ ترکی جواب دے کر جانے لگی تھی۔

"چلا ہی جاؤں گا اس شہر، بلکہ ملک سے پھر راستے بھی ویران ہوں گے اور دل بھی۔ تمہاری یہ اکڑ یونہی ختم ہو گی۔ جب کوئی راہ نہیں ہو گی تو میں یاد آؤں گا۔"

اس نے تلملا کر اس دعویدار کو دیکھا۔

"بہت خوش فہمی ہے تمہیں؟ اقبال بھائی کا رشتہ آیا ہے میرے لیے امی نے مثبت جواب بھی دے دیا ہے۔ تم خاطر جمع رکھو میں نہیں یاد کروں گی تمہیں۔"

وہ اسے بے یقینی سے دیکھتا رہ گیا۔

"جھوٹ بول رہی ہو تم؟"

قنوت نے گھور کر اسے دیکھا۔

"جھوٹ سچ تمہارا جو دل چاہے سمجھو۔"

نہ جانے اس نے کیوں یہ بات کہی تھی۔

"سنو تم انکار کر دو۔"

چند قدم چل کر اس نے ہدایت دی۔

"میرا دماغ نہیں خراب۔"

وہ تنک کر بولی۔

"قنوت! میں سیدھے طریقے سے کہہ رہا ہوں ورنہ۔" وہ تھم گئی۔ عکراش بھی رک گیا۔

"کیا ورنہ؟ کیا کرو گے تم؟"

وہ کرنے کو بہت کچھ کر سکتا تھا مگر اس کی سیاہ آنکھوں کے اعتماد کو دیکھ کر لب بھینچ گیا۔ نگاہ بھی پھیر لی۔ اور قدم بھی بڑھا لیے۔

اپنی دکان کا کھلا شٹر دیکھ کر وہ دھک سے رہ گئی۔ وہ پل بھر کو رکی۔

دوسرے ہی لمحے وہ بھاگتی ہوئی دکان تک پہنچی تھی۔

☆☆☆

اس کے آنے سے پہلے ہی وہ مزدوروں کو سارا کام شروع کروا چکا تھا۔ اسے دکان کھلی دیکھ کر، شدید غصہ آیا تھا۔

"کس سے پوچھ کر تم نے یہ کام شروع کروایا ہے؟ میری دکان سامان سے بھری ہوئی ہے۔ کیش پڑا ہوا ہے دراز میں اور تم نے مزدوروں کے حوالے کر دی۔"

وہ اچھی طرح واقف تھی اس کے سوا کسی کو نہیں اٹھ سکتا تھا اس کی مدد کا۔

"مزدور ہیں چور اچکے نہیں۔ میرے اعتبار کے بندے ہیں۔"

وہ سرد سا تھا۔ بے تاثر لہجہ، بے تاثر چہرہ۔

"مجھے نہیں اعتبار کسی کا۔ یہ میری دکان ہے، مجھ سے پوچھے بغیر تم کیسے یہ سب کروا سکتے ہو؟ یہاں ایک تنکا بھی میری مرضی کے بغیر نہیں آتا ہے تم۔"

وہ سینے پر ہاتھ باندھے ایستادہ تھا۔ ایسے لگا وہ کسی دیوار سے مخاطب ہو۔

"تم سے کچھ کہنا ہی فضول ہے۔ میں چچا سے بات کرتی ہوں۔ حد ہو گئی ہے۔ میری دکان کو کھنڈر کر رکھ دیا۔"

وہ بولتی ہوئی مزدوروں کو نکالنے لگی۔ سب کا چہرہ لیے اسے دیکھ رہے تھے۔ دراز بھی چیک کیا پیسے جوں کے توں موجود تھے۔

"تم نے کیا چور سمجھ رکھا ہے مجھے؟"

وہ اس کی اٹھا پٹخ دیکھ رہا تھا۔ اس کی بات ان سنی کر کے، وہ مزدوروں سے مخاطب تھی۔

"جاؤ تم سب۔ مجھے کام کروانا ہوا تو خود کرواؤں گی۔"

اس نے دراز زور سے بند کی۔

"یہ کیا بچپنا ہے؟ اب کام شروع ہو چکا ہے۔"

اسے مزدوروں کی بے عزتی منظور نہ تھی۔ وہ بیچارے عکراش کا منہ تکتے، تو کبھی اسے دزدیدہ نظروں سے دیکھتے جو آگ اگل رہی تھی۔

"بچپنا تم کر رہے ہو۔ جب منگنی ختم ہو چکی تو کیوں میرے معاملات میں ٹانگ اڑا رہے ہو۔ جاؤ جا کر اپنی دکان کی مرمت کرواؤ۔"

اس کا لہجہ بگڑا ہوا تھا۔ عکراش کو صاف طنز لگا۔

"اس دکان میں بھی صرف تمہاری محنت نہیں شامل۔ ابا نے مدد کی تھی تمہاری۔ پتا نہیں کس بات پر اتنا اکڑتی ہو؟"

وہ کیا بول گیا تھا۔ وہ پتھر کی ہو گئی۔

"وہ قرض ادا کر چکی ہے۔ انتہائی کم ظرف نکلے۔ ناخلف، ناہنجار وہ تمہارے باپ نے قرض دیا تھا، تمہارا کوئی احسان نہیں۔ دفع ہو جاؤ یہاں سے۔"

فہیم چچا، فضل کے ساتھ آئے تھے۔ اور بروقت آئے تھے۔ یہاں گھمسان کا رن پڑا تھا۔ کئی دکان داروں کی دکانیں کھل چکی تھیں۔ کچھ ابھی بند تھیں مگر ان کی بلند آوازیں آنے والوں تک بہ خوبی پہنچ رہی تھیں۔

وہ بھی رکا نہیں۔

اور وہ دم سادھے کھڑی رہی۔ کیسا طعنہ دے گیا تھا وہ۔ چچا نے آگے بڑھ کر مزدوروں کو کام کرنے کی ہدایت دی۔ فضل کو ان کی نگرانی پر لگایا۔

"بیٹا! میں جانتا ہوں وہ غلط بات کہہ گیا

ہے۔اس کی طرف سے میں تم سے معافی مانگتا ہوں۔"

"چچا کی ندامت اور معذرت اس کا دکھ اور غصہ کم نہیں کر سکتی تھی مگر اسے گوارا نہ تھا کہ وہ اس طرح شرمندہ ہوں۔"

"آپ کیوں معذرت کر رہے ہیں؟ اور ٹھیک ہی تو کہا ہے اس نے، آپ نے احسان کیا ہے مجھ پر۔"

اس کا لہجہ اکھڑا ہوا تھا۔وہ احسان فراموش نہیں تھی۔نہ ہی اسے احسان ماننے میں دقت تھی مگر وہ جو جتا کر گیا تھا وہ اس کی مقروض نہیں تھی۔نہ وہ محسن تھا پھر بھی باپ کے نام پر اسے طعنہ دے گیا تھا۔

"جو بات وہ کہنا چاہتا ہے، وہ کبھی کہہ نہیں سکا اور جو نہیں کہنی چاہیے وہی منہ سے نکل جاتی ہے۔"

وہ شاید بیٹے کے احساسات کے ترجمان بننا چاہ رہے تھے۔

"تم دونوں ضدی ہو۔فرق صرف یہ ہے کہ تم اپنوں کے لیے جدو جہد کر رہی ہو، اور وہ اپنے خوف سے لڑ رہا ہے۔"

قنوت چونکی۔"خوف؟"

"ہاں، خوف۔ وہ اس ملک سے، حالات سے، غربت سے، حادثوں سے، محرومیوں سے ڈرتا ہے۔اور سب سے بڑھ کر ہار جانے سے ڈرتا ہے۔مگر مردوں کو رونا نہیں سکھایا جاتا، اس لیے وہ غصہ کرتے ہیں۔خوف کا اظہار کرنا اپنی شان کے خلاف سمجھتا ہے۔اس لیے دھونس سے کام چلاتا ہے۔اور سچ کہوں تو اسے تمہاری خود سے زیادہ پروا ہے۔اس نے بس تمہارے کام آنے کی کوشش کی ہے۔"

قنوت نے نظریں جھکا لیں۔

"اس نے آج مجھے آپ کے نام پر طعنہ دیا ہے۔کل کو زیر بار کر کے مجھے جتائے گا کہ اس نے میری مدد کی۔"

فہیم صاحب کا چہرہ سنجیدہ ہو گیا۔

"تم اس سے مت الجھا کرو۔میں اسے بھی سمجھاؤں گا۔"

اس نے سب خاموشی سے سنا مگر عکراش کے معاملے میں وہ رعایت کی قائل نہیں تھی۔قنوت کے دل میں اس کی طرف سے گرہ پڑ گئی تھی۔گھر آتے ہوئے اس نے دیکھا خاصہ کی پہاڑیاں جوں کی توں اس کے انتظار میں تھیں۔وہ دن بھر میں پہلی بار مسکرائی۔

ہوا کی رفتار تیز تھی۔فضل کہہ رہا تھا۔

"صبح سے بھائی کی شامت آئی ہوئی ہے۔ابا نے بہت سنائی ہے انہیں۔انہوں نے بھی چپ کر کے سن لی۔ویسے بھائی دل کے برے نہیں ہیں۔"

اس نے فضل کو گھور کر دیکھا۔

☆☆☆

دو دن ہو گئے تھے۔کام مسلسل ہو رہا تھا۔وہ بھی آیا تھا مگر قنوت نے اس سے بات کرنے سے گریز برتا۔

"تم گھر جاؤ۔یہ کام میں دیکھ لوں گا۔"

وہ پتا نہیں کس ڈھیٹ مٹی کا بنا تھا۔

"تم جاؤ۔یہ کام میرا ہے۔"

اس نے ایک ایک لفظ چبا کر کہا۔

"قنوت! اتنے آدمی کام کر رہے ہیں یہاں اور مجھے اچھا نہیں لگتا۔مجھے فکر رہتی ہے۔"

اس کا چہرہ تپ گیا۔

"کل تک تو یہ مزدور تمہارے اعتبار کے ہی تھے ناں؟ اب کیا ہوا؟"

اس نے گھور کر دیکھا۔

"میں کہہ رہا ہوں ناں جاؤ یہاں سے۔"

وہ بھڑکا تھا۔

"تم جا کر ناں اپنی بہنوں کی فکر کرو، ان پر پابندی لگاؤ۔میرے باپ، بھائی مت بنو۔"

وہ غصے میں پٹڑی سے اتری تھی۔ اور اب تپنے کی باری اس کی تھی۔

"بکواس مت کرو۔"

وہ دبی آواز میں غرایا تھا۔

"تمہیں مجھ پر دھونس جمانے کا حق نہیں۔"

وہ بھی پھنکاری تھی۔

"کیا ہر وقت تم دونوں بچوں کی طرح لڑتے رہتے ہو؟"

اقبال بھی حسب معمول چلا آیا تھا۔ عکراش کی نادانی کے بل مزید بڑھ گئے۔ قنوت نے رخ موڑ لیا۔

"تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ دکان میں ابھی کلینس کا کام ہو رہا ہے۔ اور بہت سی دکانیں ہیں جہاں سے تم اپنے بھتیجے کے لیے کتاب پینسل خرید سکتے ہو۔"

وہ بھڑکا تھا۔

"آرام سے یار! میں دیکھنے آیا تھا قنوت کو کسی مدد کی ضرورت تو نہیں۔"

اس نے نرمی سے کہا۔

"تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔"

"عکراش! پلیز کوئی تماشہ مت لگاؤ۔ بازار میں کچھ عزت ہے ہماری۔ بلکہ تم یہاں سے چلے جاؤ یہ بہتر ہے۔"

وہ مزید بھی کچھ کہتا لیکن قنوت نے بروقت مداخلت کی تھی۔

وہ اقبال کو کینہ توز نظروں سے دیکھتا۔ غصے میں چلا گیا۔

"اقبال بھائی! مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ ہی سمجھنے کی کوشش کریں۔ میں کسی کی بھی مدد کے بغیر اپنا کام کر سکتی ہوں۔"

وہ تنگ آ گئی تھی۔

اقبال کے جانے کے بعد وہ ہر چیز کا باریک بینی سے جائزہ لینے لگی۔ مزدور کام کر رہے تھے اور اسے اپنی نگرانی میں کام کروانا اچھا لگ رہا تھا۔

☆☆☆

رات کی تاریکی پر پھیلانے لگی تھی۔

وہ چچا کے ساتھ گھر کی طرف جا رہی تھی جب فضل ہانپتا ہوا، دور سے ہی ابا، ابا کرتا ہوا ان تک آیا تھا۔

"ابا! جلدی آئیں، عکراش بھائی، وہ زخمی ہو گئے ہیں۔"

"یا اللہ خیر!"

فہیم صاحب کے قدم لڑکھڑا گئے، انہیں قنوت اور فضل نے سہارا دیا۔ قنوت کے چہرے کا رنگ بھی فق ہو گیا۔

چند لمحوں بعد وہ لوگ جائے وقوعہ پر موجود تھے۔

ایک موبائل چھیننے والا، عکراش کے ہتھے چڑھ چکا تھا۔ دوسرا موٹر سائیکل چھوڑ کر فرار ہو گیا تھا۔

عکراش سڑک کے کنارے بیٹھا تھا۔ بائیں بازو سے خون بہہ رہا تھا۔ گولی چھو کر نکل گئی تھی، مگر خون کافی بہہ چکا تھا۔

اس کے ایک ہاتھ میں اب بھی اپنا موبائل تھا۔ اور دوسرے ہاتھ سے اس نے اسنیچر کا گریبان پکڑ رکھا تھا۔ اس کے اردگرد لوگوں کا مجمع تھا اور سب اسے داد و تحسین سے نواز رہے تھے۔ کچھ راہ گیر اور ریڑھی بان، اس کی بہادری کا آنکھوں دیکھا احوال سنا رہے تھے۔

فہیم صاحب اور فضل فوراً اس کی طرف بڑھے۔

مگر عکراش کی نظریں بے اختیار پیچھے کھڑی قنوت کو دیکھ کر ساکت ہوئی تھیں۔ وہ وہاں تھی۔

سیاہ چادر میں لپٹی، پریشان اور خوف زدہ۔ مگر وہ آگے نہیں بڑھی۔

عکراش کی آنکھوں میں ایک لمحے کو روشنی سی ابھری۔ شاید وہ دوڑ کر آئے گی، شاید اس کی خیریت پوچھے گی، شاید ان کے بیچ سب ٹھیک ہو جائے گا، مگر وہ وہیں کھڑی رہی۔ ایک قدم بھی آگے نہ بڑھی۔

اس کی نگاہوں میں خوف تھا، بے چینی تھی، مگر قدم جیسے زمین میں گڑ گئے تھے۔ فضل اس سے کچھ پوچھ رہا تھا۔ ابا اسے ڈانٹ رہے تھے۔ ایک موبائل کے لیے جان خطرے میں ڈال دی۔

اسی لمحے اقبال مجمع چیرتا ہوا پہنچا۔ اسے بھی کسی سے خبر مل گئی تھی۔

اس نے جھک کر عکراش کے بازو پر رومال باندھا۔ اس نے اقبال کو پیچھے دھکیلنا چاہا تھا۔

"او بے وقوف! خون بہہ رہا ہے۔ ایک موبائل کے لیے زندگی خطرے میں ڈال دی۔"

عکراش نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بس ایک بار پھر دور کھڑی قنوت کو دیکھا۔ وہ اب بھی وہیں تھی۔ اقبال نے اس کی نگاہ کا تعاقب کیا۔ اور پھر سب سمجھ گیا۔

"اٹھ، اسپتال چلتے ہیں۔"

عکراش کے ہونٹوں پر تلخ مسکراہٹ آئی۔

"مجھے کہیں نہیں جانا، زندہ ہوں ابھی۔"

اس کی آنکھوں کی چمک بجھ چکی تھی۔

کسی نے پولیس کو بھی اطلاع دے دی تھی۔ موبائل چھیننے والے کی خبر گیری کے لیے دو پولیس اہلکار بھی آ گئے تھے۔ اسے باپ بھائی کے اصرار پر اسپتال جانا پڑا تھا۔ قنوت دور ہی سے چلی گئی تھی۔ وہ اپنے بازو کے زخم سے زیادہ اس کی بیگانگی دیکھ کر درد محسوس کر رہا تھا۔

اسپتال میں مرہم پٹی کے دوران فہیم صاحب اسے ڈانٹتے رہے۔

"جان زیادہ قیمتی ہے یا موبائل؟ اگر تمہیں کچھ ہو جاتا؟ میری عمر بھر کی کمائی، میری جمع پونجی تو تم ہو۔"

عکراش کب سے خاموش تھا۔ باپ کے آبدیدہ ہونے پر چپ نہیں رہا گیا۔

"موبائل نہیں تھا ابا! یہ میری ضد تھی۔ میں اپنا کچھ بھی کسی اور کے لیے کیسے چھوڑ دوں؟"

فہیم صاحب چونکے تھے۔ دوائیاں لے کر آنے والا اقبال بھی تھم گیا۔

"کیا مطلب؟"

فہیم صاحب نے الجھ کر استفسار کیا۔

"آپ کی حق حلال کی کمائی سے خریدا گیا موبائل ہے۔ ایسے ہی کسی کو کیوں دیتا؟"

وہ ازلی لاپروا لہجے میں بولا تھا۔

"تم سے قیمتی تو کچھ نہیں ہے۔ ایسے کئی موبائل تمہارے اوپر سے وار کر پھینک دوں۔"

باپ کی آنکھیں نم تھیں۔

"اس لیے تو کہتا ہوں مجھے باہر جانے دیں۔ یہاں تو جان کی قیمت چالیس، پچاس ہزار کے موبائل سے بھی کم ہے۔"

عکراش تلخ ہوا تھا۔ فہیم صاحب کی آنکھوں میں سوچ کا عکس لہرایا۔

☆☆☆

وہ بار بار بے خیالی میں ہی نگاہ اٹھا کر دیکھتی تھی۔ مگر کیا فائدہ؟ وہ اب سامنے کاؤنٹر پر موجود نہیں ہوتا تھا۔

اس نے شام کو سامنے کرسی ڈالنا چھوڑ دیا تھا۔ اب وہ اسے دیر سے جانے پر ٹوکتا نہیں تھا۔ دو بار اس نے دانستہ دکان دیر تک کھلی رکھی۔ وہ فہیم چچا کی دکان پر آیا بھی مگر غلطی سے بھی اس طرف نہ دیکھا۔

فضل کو بھی اس نے کہہ دیا تھا۔

"وہ بچی نہیں ہے۔ اپنی ذمہ داریاں خود سنبھال سکتی ہے۔ آئندہ ہر وقت اس کے آگے پیچھے مت گھومنا۔"

وہ تو بھائی کو ہدایت دے کر جاتا تھا اس کی دکان کا بھی خیال رکھنا۔ فضل اتنا حیران ہوا کہ قنوت کو اس کے خیالات سے آگاہ کر دیا۔

قنوت نے پہلے پہل سکون محسوس کیا تھا۔ اچھا ہے جان چھوٹی۔ بلاوجہ رعب جمانے کی کوشش کرتا تھا۔ اب تو طعنہ بھی دے گیا تھا۔ وہ لاشعوری، اور شعوری طور پر اس کی غیر موجودگی اور بے نیازی

ں کر رہی تھی۔ دو دن بعد اطمینان کی جگہ بے چینی
لے لی۔ پھر عجیب سے خالی پن نے۔
اب نہ کوئی شٹر اٹھانے اس سے پہلے پہنچتا تھا۔
ات گئے گھر جانے پر ڈانٹ پڑتی تھی۔
اور وہ جیسے اس کی منتظر تھی۔
اس نے ہر بار خیال آنے پر سر جھٹک دیا۔ ان
ا منا بار ہا ہوا مگر وہ عکراش کے بدلے تیور دیکھ کر
ج پرسی تک نہ کر سکی۔ خیریت نہیں پوچھی۔ وہ ہی
ج نہیں دے رہا تھا بلکہ اس سے بڑھ کر اجنبی بن
کھا رہا تھا۔
انا کی جنگ دونوں فریقین کو خسارے کے سوا
ہیں دیتی مگر وہ بھی اپنے محاذوں پر ڈٹ گئے۔
دکان کی مرمت ہوگئی۔
نئے سرے سے رنگ و روغن ہوا تو دکان پہلے
زیادہ چمک گئی۔ اس نے مزدوروں کو کام کا
وضہ دینا چاہا، پتا چلا وہ پہلے ہی حساب چکتا
چکا۔ اس نے پیسے فہیم چچا کے حوالے
دیے۔ اس سے الجھنے کا ارادہ اب قنوت کا بھی
ں تھا۔

☆☆☆

وہ آج سر شام ہی گھر آ گئی تھی۔
اس رات، اس نے کھانا بھی نہیں کھایا۔ بس
ں کروٹیں بدلتی رہی۔ نہ کچھ سوچا جا رہا تھا۔ نہ نیند
ہی تھی۔ ساڑھے بارہ کا وقت تھا۔ اسے رات
دیوں پر محیط لگنے لگی۔
وہ اٹھ بیٹھی۔
نہ کتاب نہ موبائل سب ایک دوسرے میں
ضے لگے۔ وہ خود پر جھنجھلائی۔
"کیا ہو گیا ہے مجھے؟ یہی تو چاہتی تھی میں،
ب سب کچھ میری منشاء کے عین مطابق ہے۔ نہ اس
ہارو ک ٹوک ہے، نہ اس کی مداخلت ہے۔
نہ اس کا ہر وقت سامنے موجود رہنا۔ اب سب
تم ہو گیا، پھر دل میں یہ بے نام سا خلا کیوں در
آیا؟ یہ سناٹے مجھے کیوں ہولا رہے ہیں؟"
اس نے سر تھاما۔
"چلا ہی جاؤ گا اس شہر بلکہ ملک سے پھر راستے
بھی ویران ہوں گے اور دل بھی۔ تمہاری یہ اکڑ یونہی
ختم ہوگی۔ جب کوئی راہ نہیں ہوگی تو میں یاد آؤں
گا۔"
فہیم چچا نے آج بتایا تھا وہ جا رہا ہے۔ امریکہ یا
کینیڈا کا ویزا تو نہیں ملا۔ اس نے فی الفور اٹلی جانے
کا انتظام کر لیا تھا۔ گولی لگنے والے واقعے کے بعد گھر
والوں کی مخالفت نے بھی دم توڑ دیا تھا۔
اس کی حیرانی دیکھ کر چچا پتا نہیں کیا سمجھے کہ
وضاحت دینے لگے۔
"میں ڈرتا ہوں۔ اس کی بے روزگاری اور یہ
حالات مل کر اس کی تلخی کو کوئی منفی موڑ نہ دے
دیں۔ اس کی مایوسی کہیں اسے حالات کی طرح ہم
سے بھی متنفر نہ کر دے۔ بہتر ہے کہ وہ یہاں سے
جا کر اپنے راستے خود تلاش کرے۔ اور اگر واپس
آئے تو پورے دل سے۔"
وہ ایسے سن ہو گئی تھی جیسے وجود سے روح کھینچ لی
گئی ہو۔ وہ بے یقین تھی۔ مگر یہی سچ تھا وہ جا رہا
تھا۔ دل میں ناراضی کا جہان آباد کیے۔
اس کے رت جگے سے بے پروا، اس کی بے
چینی سے لاعلم۔
اپنی عادت ڈال کر اکثر لوگ زندگی سے یونہی
نکل جاتے ہیں۔ مصیبت تو ان کے لیے ہوتی ہے
جنہیں وہ چہرہ دیکھنے کی، آواز سننے کی، اور ان کی
موجودگی کی عادت پڑ جائے۔ وہ تو کسی سے شکایت
بھی نہیں کر سکتی تھی کہ شکایت کا حق بھی نہیں تھا۔ اس
نے خود ہی تو یہ گنجائش ختم کی تھی۔ اب خود کو پوشیدہ
رکھنا، انا کا پرچم بلند رکھنا بھی از حد ضروری تھا۔

☆☆☆

پورے چاند کی رات تھی۔ اس کے دل پر پہاڑ
جیسا بوجھ تھا۔ وہ اس وقت بے زاری اور ناراضی کا
اظہار کرنے کے لیے کمرے سے نکل کر چھت پر آ گیا
تھا۔ ماں باپ کی سماعت و بصارت تو آہٹوں پر لگی

ہوتی ہے۔سب بھانپ لیتے ہیں۔

"عکراش اب تک جاگ رہے ہو۔پھر سگریٹ پینی شروع کردی؟"

وہ سب سے زیادہ سخت گیر اسی کے لیے تھے۔اسی کی طرف سے انہیں خدشات لاحق رہتے تھے۔

"نہیں،بس نیند نہیں آرہی تھی۔"

اس نے سیدھے سبھاو جواب دے کر انہیں حیران کردیا۔

"اب کیا ہوا جو بھوک اور نیند اڑی ہوئی ہے؟جاتو رہے ہو باہر ملک۔اب کیوں خوش نظر نہیں آرہے؟قنوت سے ناراضی ختم کردو تاکہ مزاج بہتر ہو۔"

اس نے رات کا کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔آج کل وہ ایسے ہی ہر شے سے بیزار نظر آتا تھا۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔"

وہ جانتے تھے بات ایسی ہی ہے۔

"تم دونوں کی لڑائی نئی تو نہیں۔"

عکراش نے آسمان کی طرف دیکھا۔کوئی ستارا ٹوٹا تھا۔

"اس بار لڑائی نہیں ہوئی۔"

"پھر؟"

"بس سمجھ میں آگیا ہے۔وہ مجھے ناپسند کرتی ہے۔مجھ سے یہی بات برداشت نہیں ہورہی۔اور میں اتنا گیا گزرا نہیں کہ زبردستی اس پر مسلط ہوجاؤں۔"

فہیم صاحب ششدر رہے۔

"تم سے یہ کس نے کہا کہ قنوت بیٹی تمہیں پسند نہیں کرتی؟"

باپ کے معصومانہ سوال پر اسے ہنسی آگئی۔

"ابا!آپ بھی جانتے ہیں وہ مجھ سے بے زر رہتی ہے۔شاید مجھے کام چور،بے روزگار اور خود پسند سمجھتی ہے۔یا بدنیت کہیں میں اس کی دکان پر قابض نہ ہوجاوں۔"

"ایسا نہیں ہے۔تم غلط سمجھ رہے ہو۔"

انہوں نے بیٹے کو سمجھانا چاہا۔

"ایسا ہی ہے۔جب گولی لگنے کے بعد بھی وہ قریب نہ آئی،مجھ سے احوال نہیں پوچھا تو مزید کیا سمجھنا باقی رہ گیا ہے؟"وہ تلخ ہورہا تھا۔

"مگر۔"

فہیم صاحب تو چاہتے تھے۔اس کے جانے سے پہلے ان دونوں کا نکاح ہوجائے۔وہ کچھ کہہ ہی نہ سکے۔

"ابا!اب کچھ نہ کہیں۔بس میں یہاں سے جانا چاہتا ہوں۔"

وہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔فہیم صاحب بھی گہری سانس لے کر اپنے کمرے کی طرف آئے۔نعیمہ دروازے پر کھڑی تھیں۔باپ بیٹے کی ساری گفتگو انہوں نے سنی تھی۔

"وہ لڑکی بہت خودسر ہے۔"

انہیں قنوت بری لگنے لگی تھی۔

"ان کے درمیان بس غلط فہمیاں ہیں۔"

انہوں نے برہمی سے شوہر کو دیکھا۔

"وہ اس کی دکان داری کی وجہ سے خائف تھا۔مگر یہ لڑکی خود کو پتا نہیں کیا سمجھتی ہے۔"

فہیم صاحب نے بحث نہیں کی اپنی جگہ پر لیٹ کر آنکھیں موند لیں۔ذہن اسی نہج پر سوچ رہا تھا۔

"شاید یہی ٹھیک ہے۔وہ اپنے گھر والوں کے پاس رہنا چاہتی ہے جبکہ عکراش کا ارادہ باہر سیٹل ہونے کا ہے۔وہ پاکستان میں رہنا ہی نہیں چاہتا۔اب وہ جارہا ہے اور کیا پتا وہ لوٹ کر کب آئے گا؟آئے گا بھی یا نہیں؟"

وہ کئی خدشات کا شکار تھے۔وہ چاہتے تھے یہ سب غلط ثابت ہوجائیں۔

☆☆☆

زندگی ایک ہی ڈگر پر چل نکلی تھی۔دن عجیب بے رنگ تھے۔

وہ صبح سے شام تک مصروف رہتی،مگر ہر

مصروفیت کے بیچ ایک لمحہ ایسا ضرور آتا جب نگاہ بے
یار سامنے اٹھ جاتی۔ اتنے سال بعد بھی قنوت کی
نے اسے ڈھونڈنا نہیں چھوڑا۔
اس دن دوپہر کے وقت فضل نے آہستہ سے

"باجی! عکراش بھائی نے وہاں شادی کرلی
۔"

دل کی دھڑکن ایک پل کے لیے رکی تھی۔ پھر
نے بے نیازی سے رجسٹر بند کیا۔
"تو میں کیا کروں؟"
اس نے فضل کو گھور کر دیکھا۔
"کچھ نہیں، میرا مطلب ہے بھائی نے کہا تھا
پ کو بھی بتادوں۔"
قنوت کے اندر آگ لگ گئی۔ (تو وہ سمجھتا تھا
وہ اس کی منتظر ہے۔ گھٹیا فضول انسان۔)
اس کا وہ ہی غصہ عود کر آیا۔ جسے وہ تین سال
ے بھولے بیٹھی تھی۔ اندر کہیں خلش تھی۔ ندامت
ں کہ اسے کیا کچھ نہ کہا تھا، پھر گولی لگنے کے بعد
چھا بھی نہیں۔ وہ خاموشی سے چلا گیا۔ ملے بغیر
نی صورت دکھائے بغیر۔ اور اب سارے
بتاوے، غصے کی بھڑکتی آگ میں راکھ ہوگئے۔
"جاو، جاکر اپنا کام کرو۔ میرا دماغ مت
اب کرو۔"
وہ فضل پر بھڑکی۔ وہ فوراً اپنی دکان کی طرف
گا۔ وہ بی ایس سی کا طالب علم اب بھی قنوت سے
تا تھا یا پھر احترام تھا اس کا۔
اس شام ثانیہ اور عارفہ اس کی دکان پر آئی
یں۔ ثانیہ نے ایک چھوٹا سا اسکول کھولا تھا۔ جہاں
وں کو بغیر فیس کے اچھے ماحول میں بنیادی تعلیم
ینے کا آغاز کیا تھا۔ کچھ ضرورت مند بچوں کے لیے
یاں، پنسلیں اور کتابیں بھی خود خریدنے آئی
ی۔ مطلوبہ چیزوں کے بعد اس نے رجسٹر اور پین
کے علاوہ بچوں کے لیے کچھ گفٹس بھی لیے تھے۔۔
قنوت اس کے جذبے سے متاثر ہو رہی تھی۔
حسب معمول دونوں بہنیں ہنستی بولتی رہیں۔
"بہت اچھا کام کر رہی ہو تم۔ یہ کچھ گفٹس
میری طرف سے بچوں کو دے دینا۔"
قنوت نے ریل گاڑی اور بس کے ڈیزائن
والے پینسل بکس کاونٹر پر رکھے۔
"ارے نہیں یار! بچے ہی ابھی کم ہیں۔ اور ہم
کسی کی مدد کے بغیر یہ کام کرنا چاہتے ہیں۔ بھائی
نے شروع کروایا ہے یہ اسکول، وہ ہی فنڈ بھیجیں
گے۔ ویسے تم غیر تو نہیں مگر اب بات دوسری
ہے۔ خیر امی تو خوش ہیں، کہتی ہیں لڑکا سنبھل گیا
ہے۔ اور وہاں جاکر اپنے لوگوں کی ترقی اور ملک و
قوم کے بچوں کے مستقبل کی فکر کرنے لگا ہے۔ صفدر
بھی بہت مدد کر رہے ہیں۔ تم بس اللہ سے ہماری
کامیابی کی دعا کرو۔"
قنوت کے اعصاب تن گئے۔ وہ بڑا عقل مند
ہوگیا تھا ملک سے باہر جاکر۔ ملک و قوم کے بچوں
کے مستقبل کی فکر اونہہ۔ اسے عکراش کی نیک نیتی پر
بھی شک تھا۔
"ارے ہاں، بھائی نے وہاں شادی بھی کرلی
ہے۔"
قنوت خاموش رہی۔ دوپہر میں فضل نے
اسے بتادیا تھا۔
گھر کی نئے سرے سے تعمیر، فضل کی ون ففٹی
نئی بائیک، دکان کی مرمت۔
(پیسہ ایسے ہی تو نہیں آرہا تھا۔ کرلی ہوگی کسی
مقامی امیر لڑکی سے شادی۔) دماغ میں خیال نے
بچھو کی طرح ڈنک مارا مگر اس نے چہرہ سپاٹ رکھا۔
"ویسے بھائی بہت بدل گئے ہیں۔ کہہ رہے
تھے قنوت اب بھی، سب کا خون پیتی ہے؟"
اس نے ناگواری سے ثانیہ کو دیکھا۔
"ان کا مطلب تھا کہ تم غصہ اب بھی کرتی ہو یا
نہیں؟"
عارفہ نے بہن کو ٹہوکا مارا۔
"بھائی کو غصہ کرنے والی لڑکیاں نہیں پسند

ناں۔میں تمہیں ان کی بیوی کی تصویر دکھاتی ہوں۔بالکل انگریز ہے وہ۔"

ثانیہ نے موبائل کی اسکرین روشن کی۔اسے قنوت کے سرد تاثرات کی پروا ہی نہیں تھی۔

اتنے میں ایک ادھیڑ عمر شخص چھوٹی بچی کے ساتھ دکان میں داخل ہوا تھا۔ان کی بے تکی باتوں کا سلسلہ بھی رکا۔دونوں بہنیں پیسوں کی ادائی کر کے ہنستی مسکراتی چلی گئیں۔سامان فضل نے اٹھایا تھا۔

"میری دکان سے خریدنے آجاتی ہیں۔ان کی اپنی دکان ہے مگر۔اپنے بھائی کی طرح ڈھیٹ ہیں۔وہ ہی بھیجتا ہوگا انہیں۔جاؤ اس کے زخموں پر نمک پاشی کر کے آؤ۔بدلہ لو۔

اس کا خون کھول رہا تھا۔

گھر جاتے ہوئے فہیم چچا کو خدا حافظ کہنے آئی تو وہ بھی بہت خوش تھے۔

"تمہیں پتا چلا عکراش نے۔"

وہ اکتا چکی تھی۔

"چچا! امی کی کال آرہی ہے۔میں چلتی ہوں،خدا حافظ۔"

وہ عجلت میں پلٹ گئی۔چچا نے فضل کو آواز دی۔

"جاؤ بہن کو گھر چھوڑ کر آؤ۔"

اس کی آنکھیں نم ہوگئیں۔کم وبیش چار سال سے فہیم چچا اس کے لیے تناور درخت بنے ہوئے تھے۔بھائی کا آپریشن بھی ہوگیا تھا۔مصنوعی ٹانگ لگ گئی۔مگر وہ ہی ریڑھ کی ہڈی کا مسئلہ اکثر درپیش رہتا۔زیادہ چل نہیں سکتے تھے۔دیر تک بیٹھ نہیں سکتے تھے۔وہ دکان پر صبح اس کے ساتھ آتے تھے۔پھر وہ ہی انہیں سہ پہر تک گھر بھیج دیتی تھی۔

اس کا کام اچھا چل رہا تھا۔اب تو اس نے بازار میں ایک اور دکان کرائے پر لینے کا سوچ لیا تھا۔جبکہ امی اس کی شادی کی تیاریاں کر رہی تھیں۔اس سال تو ہر صورت اسے رخصت کرنے کی ٹھان چکی تھیں۔وہ بھی آج اسی نہج پر سوچ رہی تھی۔

"باجی!ایک بات پوچھوں؟"

اس کے ساتھ تیز قدموں سے چلتا فضل کہنے لگا۔

"ہاں؟"

وہ اپنے ہی ادھیڑ بن میں غرق تھی۔

"کیا واقعی آپ عکراش بھائی سے بہت نفرت کرتی ہیں؟"

قنوت چونکی۔

"نفرت؟"

اس نے فضل کی طرف دیکھا۔

"ہاں۔"

فضل نے آہستہ سے کہا۔

"آپ کو بھائی سے نفرت ہے؟"

اس نے لب بھینچے۔

"تم فضول باتیں بہت کرنے لگے ہو۔"

اس نے سرد لہجے میں اسے گھرکا۔

باقی راستے فضل چپ رہا گھر کے دروازے پر پہنچ کر وہ اسے سیدھا دکان پر جانے کی تاکید کرکے پلٹنے لگی تھی۔

"جانتا ہے آپ بھائی سے نفرت کرتی رہی ہو۔مگر ہم نے آپ ہی کو بھابھی کے روپ میں سوچا تھا اب بھائی نے کسی اور سے شادی کرلی ہے۔ہم خوش ہیں لیکن آپ کو تنہا دیکھ کر دکھ بھی ہوتا ہے۔اب آپ کو بھی شادی کرلینی چاہیے۔"

وہ اس کے رنگ بدلتے چہرے کی پروا کیے بغیر بولتا چلا گیا۔

"فضل!تمہارا لحاظ میں فہیم چچا کی وجہ سے کر رہی ہوں۔یہ پند ونصائح،یہ ہم دردی مجھ سے آئندہ مت کرنا۔بہت بری طرح پیش آؤں گی میں۔منہ بھی توڑ سکتی ہوں تمہارا۔"

وہ تلملاتی ہوئی گھر میں داخل ہوئی تھی۔صحن میں تخت پوش پر امی کے ساتھ،نعیمہ چچی بیٹھی ہوئی تھیں۔بھابھی چائے،مٹھائی کی پلیٹ اور سوجی کا حلوہ ٹرے میں رکھے لے آئی تھیں۔اس نے چہرے

ے بگڑے زاویے درست کرکے انہیں سلام
یا۔انہوں نے سالوں بعد خوش دلی سے جواب
۔

"آؤ بیٹھو بلکہ یہ مٹھائی کھاؤ۔"

بھابھی نے اس کی پسندیدہ گلاب جامن اس
لرف بڑھائی۔

"مٹھائی کس خوشی میں؟"

اس نے ذہن سے دن بھر کی باتیں جھٹکتے
ئے۔مٹھائی کی بابت استفسار کیا۔

"نعیمہ چچی لائی ہیں۔عکراش نے شادی کرلی
اسی خوشی میں۔۔"

نرم سی گلاب جامن اس کے گلے میں اٹک
ا۔حلق تک کڑوا ہوگیا۔لحاظ واخلاق مانع تھا ورنہ
سی وقت مٹھائی اگل دیتی۔

"ماشاء اللہ بہت پیاری بچی ہے۔ثانیہ کے
بائل میں تصویریں ہیں۔اس سے کہوں گی روبیہ
قنوت کو واٹس ایپ کردے۔اس موہنی صورت کو
ے کر تمہیں مزید خوشی ہوگی۔"

نعیمہ چچی خوش دلی سے بول رہی تھیں۔

"ماشاءاللہ۔بہت مبارک ہو آپ کو۔"

اس کی آواز اسے خود اجنبی محسوس ہوئی۔

نعیمہ چچی کا لہجہ برسوں بعد اس کے لیے نرم پڑا
۔

"بس دعا کرنا دونوں خوش رہیں۔عکراش نے
و پسند کیا ہے اسے۔بڑی سمجھ دار ہے۔"

قنوت لب بھینچ گئی۔

"ہم نے تو صرف تصویر دیکھی تھی۔پھر اس
نے نکاح کرلیا۔اب کیا کہیں؟ اولاد کی خوشی میں ہی
ی ہے۔"

عالیہ نے آہ بھری۔

"اللہ نصیب اچھے کرے سب کے۔"

امی کی دعا میں ایک امید تھی۔باتیں چلتی رہیں
مگر قنوت کے کانوں میں سناٹوں کی گونج تھی۔

رات گئے وہ چھت پر آ کھڑی ہوئی۔خاصہ کی
پہاڑیاں اسی کی منتظر تھیں۔اداس سی،روٹھی روٹھی۔
ہوا میں خنکی تھی۔آسمان پر ادھورا چاند جھلملا رہا
تھا۔

☆☆☆

اٹلی کے شمالی شہر میلان کی شام دھند اور بارش
میں لپٹی ہوئی تھی۔

وہ اپنے آفس کی دسویں منزل پر واقع وسیع
کیبن میں کھڑا تھا۔فرش سے چھت تک پھیلی گلاس
وال کے پار پورا شہر دھندلا سا دکھائی دے رہا تھا۔

آفس میں غیر معمولی خاموشی تھی۔

"کہاں ہو؟"

یہ شازمین کا پیغام تھا۔کچھ دیر قبل حماد نے بھی
ایسے میسج کیا تھا۔آج حماد کے گھر کوئی تقریب
تھی۔شادی ختم ہوئے مہینہ ہوگیا تھا مگر
تقریبات،دعوتیں اب بھی ہو رہی تھیں۔

باہر بارش بدستور شیشے پر دستک دے رہی تھی
اور اندر یادیں ایک بار پھر دل کے بند دریچوں کو
کھٹکھٹانے لگی تھیں۔

اس کا موبائل بجنے لگا اس نے بے دلی سے
کال ریسیو کی۔

"گھر کیوں نہیں آئے؟"

شازمین فکرمند تھی۔

"کام زیادہ تھا۔"

اس نے مختصر جواب دیا۔

"عکراش! تم پریشان ہو؟"

شازمین کو اس کے لہجے نے چونکایا تھا۔

"نہیں۔"

اس نے گلاس وال پر پھسلتے بارش کے پانی پر
سے نظر ہٹالی۔

"کام کی تھکن ہے۔" کہہ کر کال منقطع کی
تھی۔

"وہ شادی کر رہی ہے۔"

اسے یہ خبر امی نے چند دن قبل دی تھی۔

"کون؟"

اس نے بے خیالی میں پوچھا تھا۔

"ارے تمہارے عبدالرزاق چچا کی بیٹی، قنوت کی بات کر رہی ہوں۔ اب قیوم بھی دکان پر بیٹھنے لگا ہے۔ ویسے اس کے سسرال والوں کو بھی دکان چلانے پر اعتراض نہیں ہے۔ اب تو دوسری دکان بھی لینے کا سوچ رہی ہے۔ لڑکی نے بڑی محنت اور لگن سے بھائی کی دکان سنبھالی ہے۔ ساری زندگی کے لیے بھائی بھابھی کو اپنا ممنون کر لیا۔"

اس کے کان سائیں سائیں کر رہے تھے۔

کتنا خوش فہم تھا وہ، سمجھ رہا تھا، وہ اس کے لیے جوگ لے کر بیٹھی ہے۔ مگر نہیں، اسے اپنے بھائی کی صحت یابی کا انتظار تھا۔

تین سال کم تو نہیں تھے۔ وہ سمجھتا تھا کہ بیرونِ ملک قدم رکھتے ہی کامیابی اس کے سامنے دست بستہ کھڑی ہوگی، مگر جلد ہی اس کا یہ خیال باطل ثابت ہوگیا۔

ویٹر کی جاب بھی کی، پیٹرول پمپ پر بھی کام کیا۔ پھر مسلسل محنت اور جدوجہد کے بعد اسے گاڑیوں کے ایک بڑے شوروم میں منیجر کی نوکری مل گئی۔

وہیں اس کی ملاقات حماد سے ہوئی تھی۔

حماد شوروم کے مالک سجاد صاحب کا بیٹا تھا۔ اس کا پورا خاندان اٹلی میں مقیم تھا جبکہ وہ اپنی سوفٹ ویئر کمپنی چلا رہا تھا۔ ہم وطن، ہم عمر اور ہم مزاج ہونے کی وجہ سے دونوں میں جلد ہی بے تکلفی اور دوستی ہوگئی۔

ایک دن حماد نے اسے اپنی کمپنی میں کام کرنے کی پیشکش کی اور وہ فوراً آمادہ ہوگیا۔

حماد نے اسے اپنے گھر والوں سے بھی ملوایا۔

امی، بہن اور بھائی، سب ہی نفیس اور خوش اخلاق تھے۔

چند دن پہلے حماد کی شادی کی تقریب کی تصاویر ثانیہ اور عارفہ کے بے حد اصرار پر اس نے گھر بھیجی تھیں۔

شازمین کو دیکھ کر سب حیران رہ گئے تھے۔

حماد کے والد نے ایک یورپی خاتون سے شادی کی تھی، اس لیے شازمین نے اپنی ماں کے حسین نقوش اور دلکشی پائی تھی۔

"بھائی! آپ شازمین سے شادی کر لیں۔"

ثانیہ نے سنجیدگی سے مشورہ دیا تھا۔

وہ بے اختیار ہنس پڑا تھا۔

قنوت کی خبریں بھی اسے ملتی رہتی تھیں۔

اور پھر یہ خبر ملی۔ اس کا رشتہ طے ہوگیا ہے۔

اور اب شادی ہونے والی ہے۔ وہ تو اقبال کی شادی کی اطلاع پر بے فکر ہوگیا تھا۔ اقبال کی امی کو اس کی دکان پر اعتراض تھا۔ ساری تفصیل اسے ثانیہ سے پتا چلی تھی۔

پر یہ خبر سن کر دل میں ایک خاموش سی کسک جاگ گئی تھی۔ انا جیت گئی تھی محبت ہار گئی تھی۔۔

☆☆☆

بھائی کی طبعیت ٹھیک نہیں تھی۔ دونوں بھتیجوں کو اسکول پہنچا کر وہ دکان پر آ گئی۔

معمول کی طرح اس وقت سانس لینے کی فرصت بھی نہیں تھی۔ مگر ذہن گزشتہ روز کی باتوں میں الجھا ہوا تھا۔

دوپہر کو فہیم چچا حسبِ معمول سامنے سے آتے دکھائی دیے۔

کچھ دیر کام کے متعلق بات کی۔ پھر بولے۔

"وہ لڑکا اس دکان کا دشمن ہے۔ کہہ رہا تھا ابا دکان بند کر کے گھر بیٹھیں۔ اب میں کماتا ہوں۔ آپ بس آرام کریں، خبریں دیکھیں اور اپنی بیوی کے ہاتھ کے بنے کھانے کھائیں۔"

وہ آخر میں ہنسے تو قنوت بھی بہ وقت مسکرائی۔

"خیر سے آ رہا ہے۔ میں کل یہی بتانا چاہ رہا تھا۔ ثانیہ کی شادی میں بھی نہیں آیا تھا اب اچانک ہی پروگرام بنا لیا۔"

قنوت نے نظریں چرا لیں۔ فہیم صاحب نے کچھ توقف کیا۔

"ارے ہاں تمہاری چچی کل گئی تھیں ناں
مارے گھر مٹھائی لے کر۔انہوں نے بھی بتایا
؟"
اس کے دل میں خنجر کی نوک سی پیوست ہوگئی۔
"جی۔"
وہ اتنا ہی بولی۔فہیم چچا اس کے چہرے کے
لتے رنگ دیکھ رہے تھے۔
پھر اسے خیال آیا انہیں مبارک باد تو دینی
ہے۔
"چچا! آپ کو بہت مبارک ہو۔"
"خیر مبارک۔"
انہوں نے خوش دلی سے کہا۔
"ویسے ایک بات اور بتاؤں۔اس نے تین
ال میں کبھی کسی رشتے کے لیے ہاں نہیں کی۔
ماری چچی نے بہت کوششیں کیں۔ایک بار تو وہ مجھ
ے ناراض ہوگیا تھا۔کہنے لگا، ابا مجھے اپنے حال پر
وڑ دیں۔"
قنوت کا دل زہر میں بجھے تیروں سے زخمی
نے لگا۔
آخر انکار کرتے کرتے کر ہی لی شادی۔اس
ں سوچیں بھی زہر خند ہوئیں۔
"چچا! ہر انسان اپنی مرضی کا مالک ہوتا
ہے۔اس نے جو کیا وہ ہی ٹھیک ہے۔" پھر وہ ادھر
مر کی باتیں کر کے چلے گئے۔
اس نے آنکھوں کے بھیگتے کناروں کو بیدردی
سے دوپٹے کے پلو سے صاف کیا تھا۔پر آنکھوں کی
ں بھلا چھپ سکتی ہے۔

☆☆☆

اتوار کے دن وہ دیر سے دکان کھولتی تھی۔آج
ں تو قیوم بھائی بھی چلے جاتے تھے۔اب ان کی
یعت ٹھیک تھی۔اس روز بھی وہ دیر تک سوتی رہی۔
نکھ کھلی تو سورج خاصا چڑھ آیا تھا۔امی اور بھابھی
ک برنگے کپڑوں کے ڈھیر کے درمیان بیٹھی کسی
ٹ کی کٹنگ کر رہی تھیں۔
قنوت نے ایک سرسری سی نظر ڈالی اور بغیر کچھ
کہے باورچی خانے کا رخ کرلیا۔
"کیا ضرورت ہے اس کھڑاک کی؟ جہیز کے
بغیر بھی میری شادی ہوسکتی ہے۔"
دونوں خواتین نے اسے گھور کر دیکھا جو ناشتے
کی ٹرے لیے تھی۔
"ضرورت ہے محترمہ۔اب شادی طے ہوچکی
ہے، یہ نہیں کہ آخری وقت پر ہاتھ پاؤں پھول
جائیں۔"
بھابھی نے جواب دیا۔وہ بے دل سے ناشتا
کر رہی تھی۔
"آخر تم ایک بار لڑکے سے مل کیوں نہیں
لیتیں؟"
عالیہ بھی یہی چاہتی تھیں۔اسے جواب طلب
نظروں سے دیکھا۔
"مل کر کیا کرنا ہے؟"
وہ ہنوز بے نیاز تھی۔
"ارے واہ! جس کے ساتھ پوری زندگی
گزارنی ہے، اسے ایک بار دیکھ تو لو۔بلکہ ہم ان کے
پورے گھر کی دعوت کر دیتے ہیں۔وہ لوگ جب بھی
آئے تم دکان پر ہوتی تھیں۔بس ایک بار تمہیں بہت
پہلے دیکھا تھا۔وہ سب بھی تمہیں دیکھنا چاہتے
ہیں۔تم بھی مل لینا۔"
قنوت اس تقاضے سے زچ آگئی تھی۔
"امی دیکھ چکی ہیں ناں؟ اور پھر جب سب
معاملات طے ہوگئے ہیں تو اس تکلف کی کیا ضرورت
ہے؟"
وہ کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر رہی تھی۔
"میں نے پوری تسلی کے بعد ہاں کی ہے۔
خاندان بھی اچھا ہے، لڑکا بھی۔اور سب سے بڑھ کر
جان پہچان والے لوگ ہیں۔"
عالیہ مطمئن تھیں۔
"یعنی ملنے ملانے کا جھنجھٹ ہی نہیں۔"
قنوت نے سادگی سے جواب دیا۔

بھابھی نے بے بسی سے سر پکڑ لیا۔
"اللہ کی بندی! کوئی شوق، کوئی تجسس، کوئی سوال؟"
بھابھی اس کے سرد لہجے سے پریشان تھیں۔
بھابھی نے ہار نہ مانتے ہوئے کہا، "کم از کم ایک ملاقات تو کرلو۔"
قنوت ناشتہ ختم کر کے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ارادہ دکان پر جانے کا تھا۔
"اگر آپ لوگوں کی تسلی اسی میں ہے تو کرلوں گی۔"
اس کا لہجہ ایسا تھا جیسے وہ اپنی شادی نہیں، دکان کے کسی نئے سپلائر سے ملنے پر رضامند ہوئی ہو۔
اور یہی بات عالیہ کے دل کو لگ رہی تھی۔ کہیں وہ غلط فیصلہ تو نہیں کر رہیں۔

☆☆☆

اس نے وہ دو کنگن اپنے سامنے رکھے ہوئے تھے۔
"دیکھو تو یہ یاد ہی نہیں تھے۔ کل جب صندوق کھولا تو بالکل نیچے کپڑے میں بندھے ہوئے نکلے۔ یہ کنگن میں نعیمہ بھابھی کو واپس دینے جانا چاہ رہی تھی۔ مگر ہمت نہیں ہو رہی۔ اب تمہارا رشتہ طے ہو گیا ہے۔ عکراش نے بھی شادی کر لی۔ انگوٹھی تم نے واپس کر دی تھی مگر یہ امانت تو میں بھولی بیٹھی تھی۔ نہ انہوں نے تقاضا کیا۔ اب یہ تم خود اپنے فہیم چچا کو دے دینا۔ اچھا ہے وہ لوگ عکراش کی اس انگریز بیوی کو پہنا دیں گے۔ اسی کا حق ہے۔"
عالیہ نے کچھ دن قبل ہی وہ کنگن اس کے حوالے کیے تھے۔ جنہیں وہ بھی بھولی بیٹھی تھی۔
نفیس سے نقش و نگار والے بھاری طلائی کنگن بے حد قیمتی تھے۔ مگر یہ قدر و قیمت ان سے وابستہ احساسات اور جذبات کے سبب تھی۔
اس نے ایک کنگن کو اٹھا کر ڈیزائن پر ہاتھ پھیرا۔
"اب بجھی راکھ کو کرید کر کچھ نہیں ملے گا۔ مجھے یہ سب سوچنا زیب نہیں دیتا۔ اب جب چند ماہ بعد میری شادی بھی ہونے والی ہے۔"
اس نے گہری سانس لیتے ہوئے کنگن واپس اس سرخ کپڑے میں لپیٹ دیے۔ "یہ امانت ہے اور امانت لوٹانی پڑتی ہے۔"

☆☆☆

صبح کی آمد کا اعلان فجر کی اذان کے ساتھ ہوا تھا۔
اسی وقت جب وہ دعا مانگ کر چہرے پر ہاتھ پھیر رہی تھی۔ اس کا موبائل تھرکنے لگا۔ نوید کال کر رہا تھا۔
"اس وقت کال کیوں کر رہا ہے؟"
اسے حیرت ہوئی اور بٹن دبایا۔
"باجی! دکان میں آگ لگ گئی ہے۔"
وہ منہ پر ہاتھ رکھے اپنی جگہ کھڑی رہ گئی تھی۔

☆☆☆

اور جب اسے لگنے لگا تھا، زندگی کی گاڑی ایک سیدھی سپاٹ سڑک پر چل نکلی ہے تو پھر ایک مصیبت کا پہاڑ ان پر ٹوٹ پڑا تھا۔
آگ بجھ چکی تھی۔ مگر وہاں دکان کے سامان کے ساتھ اس کے حوصلے بھی جیسے راکھ ہو رہے تھے۔
اس کا دل چاہ رہا تھا، وہ چیخ چیخ کر روئے۔
پولیس بھی آ چکی تھی۔ باریک بینی سے تفتیش تحقیق ہو رہی تھی۔
"آگ لگائی گئی ہے۔"
پولیس کی ابتدائی تفتیش نے یہ بات ثابت کر دی تھی۔
"آپ کو کسی پر شک ہے؟"
ایس ایچ او اس کے بولنے کا منتظر تھا۔
قنوت نے لب بھینچ لیے۔ ذہن میں ایک ہی نام بار بار گونج رہا تھا۔
"شاہد ہمارا پرانا کرائے دار۔" اس نے بمشکل کہا۔
پولیس والے نے نوٹ بک میں نام درج

کیا۔

"کیا وجہ ہے آپ کے شک کی؟"

قنوت نے ایک لمحے کو آنکھیں بند کرلیں۔ اسے وہ سب کچھ یاد آ گیا۔

"وہ کئی بار مجھے نقصان پہنچانے کی دھمکی دے چکا ہے۔ اصل میں کچھ سال قبل اس نے ہماری دکان پر قابض ہونے کی کوشش کی تھی۔ اس وقت انعام بھائی اور فہیم چچا نے اسے نکالنے کے لیے قانون کا سہارا لیا۔ اور اب وہ بدمعاش بدلہ لینے پر اتر آیا ہے۔"

فہیم چچا حیران تھے۔ اس نے انہیں بھی نہیں بتایا تھا۔

پولیس افسر نے تفصیل سن کر سر ہلایا۔

"ہم تحقیقات کریں گے۔ اگر اس کے خلاف ثبوت ملا تو کارروائی ہوگی۔"

قنوت نے جواب میں کچھ نہ کہا۔

وہ چند قدم آگے بڑھی اور جلے ہوئے کاؤنٹر کے قریب جا کر۔ وہیں بیٹھ گئی اور دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

اس کا بھائی خاموشی سے دوسری طرف منہ پھیرے آنکھیں صاف کر رہا تھا۔

کچھ دیر بعد جب اس کے آنسو تھمے تو اس نے سر اٹھایا۔

"میں ہمت نہیں ہاروں گی۔ بھائی! ہم دوبارہ سب کچھ نئے سرے سے شروع کریں گے۔ اس بار پہلے سے بہتر۔ اگر کسی نے یہ سوچا ہے کہ میں ہار مان لوں گی تو وہ غلط سوچ رہا ہے۔"

وہ جانتی تھی کہ حاسد، اور غاصب، مجرمانہ ذہنیت کے لوگ آگ لگا کر عمارتیں جلا سکتے ہیں، انسان کے ارادے نہیں۔

☆☆☆

ایک ہفتے میں کچھ نہیں بدلا تھا۔ نہ ہی شاہد گرفتار ہوا اور نہ ہی پولیس کسی نتیجے پر پہنچی تھی۔

دکان کا زیادہ تر جلا ہوا سامان ہٹا دیا گیا تھا۔

فرش صاف ہو چکا تھا مگر دیواروں پر پھیلے سیاہ دھبے گواہی دے رہے تھے کہ یہاں کچھ دن قبل کیا قیامت گزری تھی۔

قنوت تھکے قدموں سے ایک کونے میں کھڑی تھی۔

"جو نقصان ہونا تھا ہو گیا۔ اب شاہد جیسے خطرناک شخص سے مزید دشمنی مول مت لو۔ آرام سے گھر میں ٹک کر بیٹھو۔ دو چار دن میں تمہارے سسرال والے باقاعدہ رسم کرنے آئیں گے۔" امی نے کہا تھا۔

اسے کسی چیز میں دلچسپی نہیں تھی۔ وہ امی اور بھابھی کے روکنے کے باوجود دکان پر آ گئی تھی۔ آج بھی فہیم چچا اس کے حامی تھے۔

"وہ اپنے لیے جہنم خرید رہا ہے۔ تم اللہ پر یقین رکھو وہ پکڑا جائے گا۔ اور جب جرمانہ لگے گا تو وہ تمہارا نقصان بھی پورا کرے گا۔ لیکن بیٹا تمہیں سب بتانا چاہیے تھا۔ تم نے مجھ سے کیوں چھپایا؟"

وہ متفکر سے گویا ہوئے۔

"چچا! میں کسی کو پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی اور میرا خیال تھا وہ بس دھمکی دے رہا ہے۔"

اس نے آہستہ سے جواب دیا۔ تب ہی باہر ایک گاڑی آ کر رکی۔

چند لمحوں بعد فہیم چچا کی حیران آواز سنائی دی۔

"ارے، عکاش بیٹا تم کب آئے؟"

قنوت پلٹی نہیں۔ اس کا دل بہت زور سے دھڑکا تھا۔ ایسے جیسے خاصہ کی پہاڑیوں کو بھی ہلا ڈالے گا۔ دور سمندر کی تہہ میں بھی بھونچال سا آیا تھا۔

"السلام علیکم ابا!"

اس کی بھاری مضبوط آواز وہ، ہزاروں انسانوں کے شور میں پہچان سکتی تھی۔

"وعلیکم السلام!

آ گیا میرا بیٹا۔"

وہ باپ سے بغل گیر ہوا تھا۔ چچا کی آنکھیں نم

ہو گئیں۔

وہ بھی پلٹنے سے گریزاں تھی۔ تین سال گزر گئے تھے۔

وہ آج بھی وہیں کھڑی تھی جہاں سے یہ سب شروع ہوا تھا۔ پژمردہ، خالی ہاتھ اور وہ کامیاب ہو کر لوٹا تھا۔ اس نے لب بھینچ لیے۔ فہیم چچا نے اسے سب بتا دیا تھا۔

"چچا! میں گھر جا رہی ہوں۔ نوید آ کر دکان بند کر دے گا۔ ویسے بھی اب یہاں بچا ہی کیا ہے۔"

اندر ایک ابال سا اٹھا، وہ جھٹکے سے پلٹی تھی۔ اور یوں فہیم چچا سے مخاطب ہوئی جیسے وہ موجود ہی نہ ہو۔ مگر وہ تھا اپنی چھا جانے والی شخصیت کے ساتھ۔

ایک لمحے کو دونوں کی نظریں ملیں۔ پھر جیسے وقت رک گیا۔

نہ سلام، نہ حال چال، نہ شکوہ شکایت اور نہ ہی کوئی اجنبیت اور نہ سالوں کے بعد ملنے والوں کے انداز و اطوار۔ تین سال درمیان سے ہٹ گئے۔ وہ دونوں اب بھی ویسے ہی مقابل تھے۔ مگر ایک طرف اب بھی غصہ تھا اور دوسری جانب فکر۔

"تم ٹھیک ہو؟"

تین سال بعد یہی پہلا جملہ تھا۔ اندر بہت کچھ ابھر کر ڈوبا تھا۔

اس نے ایک لفظ بھی نہ کہا۔ اور دکان سے نکلتی چلی گئی۔ عکراش نے باپ کی طرف دیکھا۔ وہ دونوں کا جائزہ خاموشی سے لے رہے تھے۔

"ابا! اس کی تو شادی ہونے والی ہے اور یہ سب؟"

وہ فکر مند تھا۔

"بیٹا! شاہد نے پرانی دشمنی نکالی ہے۔ مگر تم فکر مت کرو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ پولیس تفتیش کر رہی ہے۔"

انہوں نے اسے بھی تسلی دی۔

☆☆☆

امی نعیمہ چچی کے گھر گئی ہوئی تھیں، چچی نے انہیں کھانے پر روک لیا تھا۔ روک تو بھابھی کو بھی رہی تھیں مگر وہ قنوت کی وجہ سے آ گئیں۔ اسے آج بھائی نے جلدی گھر بھیج دیا تھا۔ بھابھی ابھی دونوں بچوں کے ساتھ شازمین سے مل کر آئی تھیں۔

"بہت ہی خوب صورت ہے شازمین اور اتنی ہی خوش اخلاق۔ تم ملو گی تو تم بھی اس کی گرویدہ ہو جاؤ گی۔ سچ عکراش نے ہیرا ڈھونڈا ہے۔ تم بھی مل لینا ہم نے انہیں گھر بلایا ہے۔"

وہ فہیم چچا کے گھر نہیں جاتی تھی۔ ثانیہ کی شادی میں بھی نہیں گئی تھی۔ وہاں سے جو رشتہ بن کر ٹوٹا تھا۔ اس کے بعد اسے خود وہاں جانا اچھا نہیں لگتا تھا۔ نعیمہ چچی کی سرد مہری بھی اسے تکلیف دیتی تھی۔ آج کل تو وہ مسکرا کر ملتی تھیں۔ پرانی ناراضی اور رعونت نہیں تھی ان کے انداز میں۔

امی اور بھابھی کا، فہیم چچا کے گھر والوں کو کھانے پر مدعو کرنے کا ارادہ تھا۔ وہ لوگ نئے شادی شدہ جوڑے کے اعزاز میں یہ عشائیہ دینا چاہ رہے تھے۔ جبکہ وہ اس دعوت شیراز کی واحد مخالف تھی۔

"بھابھی! ابھی نہیں۔ کچھ عرصے بعد انہیں بلا لیجیے گا۔"

وہ اپنی ہی الجھنوں سے عاجز تھی۔

"قنوت! تم اب اس آدم بے زاری کو چھوڑ کر عام لڑکیوں کی طرح خوش رہنے کی عادت ڈال لو۔ اور مصائب تو آتے جاتے رہتے ہیں۔ زندگی کسی ایک تکلیف یا پریشانی پر رک نہیں جاتی۔"

اکثر امی کی روح زوبیہ بھابھی میں سما جاتی۔

"مجھ سے ملمع کاری نہیں ہوتی۔"

اس نے تنک کر کہا۔

"ہاں یہ محترمہ تو چاہتی ہیں۔ اگر یہ اداس ہیں تو ساری دنیا دکھی، اور صدماتی کیفیت میں نظر آئے۔"

وہ اس آواز کو سن کر ایک دم سیدھی ہو بیٹھی۔

وہ قیوم بھائی کے ساتھ اندر آ گیا تھا۔ ہشاش بشاش اور بے فکر۔ وہ ہی دروازہ کھلا چھوڑ آئی تھی۔ اسے اب خود پر بھی غصہ آ رہا تھا۔ وہ تھی بے زار

، پریشان جبکہ عکراش کی آنکھوں کی چمک سلامت تھی وہ دندناتا ہوا دل میں گھسا چلا آرہا تھا۔ وہ کرسی سے اٹھ کر جانے لگی۔

"قنوت! بہت مبارک ہو تمہیں۔ شاہد کو پولیس نے گرفتار کرلیا ہے۔ اپنے عکراش نے اوپر سے فون کروایا ہے۔ امید ہے شاہد جلد ہی ہمارا نقصان بھی پورا کردے گا۔"

ناصرف اس کے قدم رکے بلکہ وہ دنگ رہ گئی تھی۔ اس شخص نے پھر سے اپنی دھاک بٹھانے کے لیے اس کی مدد کا بیڑا اٹھالیا تھا۔

"کیا ضرورت تھی، کسی کی سفارش کی؟ جب کہ یہ واضح ہے کہ وہ شخص مجرم ہے۔ آج یا کل پولیس کو بھی ثبوت مل ہی جاتا۔ ضروری نہیں تھا کہ آپ ہم پر یہ احسان کرتے۔"

وہ دانت پیس رہی تھی۔ جبکہ وہ اس کے آپ کہنے پر حیران ہوا تھا۔

"پتا نہیں پولیس کو کب ثبوت ملتا؟ اب تو دس دن ہونے کو آئے ہیں۔ شاہد کی گرفتاری بھی اثر رسوخ استعمال کرنے کے نتیجے میں ہوئی ہے۔ یہ کام آج کل ایسے ہی ہوتے ہیں۔"

بھائی نے عکراش کو بولنے کا موقعہ ہی نہیں دیا۔ بلکہ اسے کرسی پیش کرنے لگے تھے۔

"بیٹھ جاؤ عکراش!"

وہ بھی فرصت سے آیا تھا۔ قنوت کی چھوڑی ہوئی کرسی سنبھال لی۔ بھائی تخت پر بیٹھ گئے۔

"میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔"

بھابھی نے باورچی خانے کا رخ کیا۔

"بھابھی! آپ رہنے دیں۔ قنوت بنالے گی چائے۔ ویسے چائے تو بنانی آتی ہوگی اسے، آخر شادی ہو رہی ہے اس کی۔"

اس نے سنجیدگی سے سوال داغا۔

اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہوگیا۔ یہ شخص پھر اسے زچ کرنے کی مہم پر لگ گیا تھا۔

"ماشاء اللہ قنوت چائے اچھی بنالیتی ہے۔ البتہ کھانا بس گزارے لائق بناتی ہے۔"

بھابھی نے دبی دبی مسکراہٹ کے ساتھ بتایا۔

وہ پاؤں پٹختی ہوئی اپنے کمرے میں آگئی۔ اس کا ہر لفظ اسے اپنی توہین محسوس ہو رہا تھا، مسکراہٹ طنز، صاف دل جلانے والے انداز تھے۔

بھابھی نے کچھ دیر بعد کمرے میں جھانکا۔

"تمہیں، بھائی بلا رہے ہیں تمہارے۔"

وہ جو اس کے جانے کی ہی منتظر تھی۔ فوراً دوپٹہ سر پر اوڑھ کر باہر آئی۔ بھائی اب بھی تخت پر بیٹھے تھے۔

"بیٹھو قنوت!"

بھائی سے وہ ناراض تھی۔ منہ پھلا کر کرسی پر براجمان ہوگئی۔

"قنوت! وہ مخلص انسان ہے۔ بے شک کچھ خود پسند بھی ہے۔ لیکن اس نے کبھی ہمارا برا نہیں چاہا۔ تم یہی دیکھ لو۔ برے حالات میں ہمارے رشتے داروں نے منہ موڑ لیا مگر فہیم چچا اور ان کا پورا خاندان ہمارے ساتھ رہا۔ بلکہ میں تو فہیم چچا کا اور عکراش کا، ہمیشہ ممنون رہوں گا۔ جس طرح ان لوگوں نے تمہارا خیال رکھا۔ وہ احسان، میں کبھی نہیں چکا سکتا۔ اب دیکھو وہ تین سال بعد اٹلی سے واپس آیا ہے اور پھر بھی غرور نام کو نہیں اس میں۔ اس نے خود سے ہماری مدد کی ہے۔ ہمیں اس کا احسان مند ہونا چاہیے، مگر اس کے برعکس تم بدلحاظی کا مظاہرہ کر رہی تھیں۔ وہ ایک کپ چائے پیے بغیر چلا گیا۔ اور کچھ نہیں مہمان تو تھا ہمارا۔"

بھائی کا لہجہ متاسف تھا۔

"کون مہمان آیا تھا؟"

امی کھلے دروازے سے اندر آئی تھیں۔ بس آخری الفاظ ہی سن سکیں۔ بھائی کی طرف ملتجی نظروں سے دیکھا۔ امی کو خبر ہوتی تو گلو خلاصی کروانی مشکل ہوجاتی۔

"امی! دکان کی بات کر رہے تھے۔ آپ بیٹھیں ناں۔"

وہ یک دم بڑی مستعد نظر آنے لگی تھی۔

"نہیں عشاء کی نماز پڑھوں گی میں۔ قیوم! کل کی دعوت رکھی ہے میں نے۔ فہیم بھائی کا سارا گھر آئے گا۔ ثانیہ، اس کا شوہر اور ساس بھی۔ تم کھانا باہر سے ہی منگوالینا۔ زوبیہ اکیلی کیا کیا کرے گی؟ یہ لڑکی تو تنکا تک نہیں توڑتی گھر میں۔ کھانا بھی مریضوں والا بناتی ہے۔ پتا نہیں سسرال جا کر کیا ہی نام روشن کرے گی میرا؟" جاتے جاتے انہوں نے اسے خوب سنائیں۔

بھائی کی باتیں اسے درست لگی تھیں۔

وہ خود کو گھرک رہی تھی۔ عکراش یوں تھا جیسے ان کے درمیان کبھی کوئی بدمزگی ہوئی ہی نہ ہو۔ بلکہ وہ تو ٹوٹ جانے والے تعلق کو بھی بھول چکا تھا۔ زندگی میں اتنا آگے بڑھ چکا تھا کہ ماضی کا کوئی دکھ، کوئی ملال، کوئی پچھتاوا اس کے لب و لہجے سے ظاہر نہیں ہو رہا تھا اور وہ اب تک پرانی باتوں کو نہیں بھولی تھی۔

"کل جب سب آئیں گے تو میں خوش اخلاقی سے پیش آؤں گی۔ میں کوئی احسان فراموش نہیں۔ عکراش فہیم چچا کا بیٹا ہے اور فہیم چچا کے احسانات۔"

ان کے احسانات وہ انگلیوں پر بھی نہیں گن سکتی تھی۔ لہٰذا زیادہ نہیں سوچا۔ بس خود کو آنے والے کل کے لیے تیار کرنے لگی۔

☆☆☆

وہ سفید رنگ کے ٹخنوں کو چھوتے فراک پاجامے اور بڑے سے دوپٹے میں ملبوس سادہ چہرے کے ساتھ بھابھی کو غصہ دلا گئی تھی۔ بال بھی اس نے جوڑے کی شکل میں لپیٹ رکھے تھے۔

"قنوت قنوت! کچھ تو خیال کرو۔ سب آئے ہوئے ہیں اور تم نے ایک تو سفید رنگ پہن لیا۔ اس پر یہ سوگوار شکل۔ نہ میک اپ نہ ڈھنگ کا ہیئر اسٹائل۔ کیا سوچے گی شازمین، تمہیں، عکراش کی شادی کا دکھ ہے؟ آخر وہ تمہارا سابقہ منگیتر تھا۔"

اور وہ اس آخری جملے پر سرد سی پڑ گئی۔ اس نہج پر تو اس نے سوچا ہی نہیں تھا۔ لوگ اس تناظر میں بھی دیکھتے ہیں۔

"ایسے ہی ٹھیک ہوں میں اور مجھ پر ترس کیوں کھائے گی؟ کیا وہ دماغ سے معذور ہے؟ اچھی بھلی ہوں میں، مجھے کسی کے لیے ملمع کاری کرنے کی ضرورت نہیں۔"

اس کا دوٹوک جواب حاضر تھا۔ جواب بھی ایسا کہ بھابھی نے دروازے کی سمت دیکھا۔ گھر اتنا بڑا نہیں تھا۔ اور آواز دروازے سے باہر سنے جانے کا امکان بھی موجود تھا۔

ثانیہ نے دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔

"تم ایسے ہی ٹھیک ہو۔ مگر کچھ نہ کچھ دنیاداری بھی کرنی ہی پڑتی ہے۔ بھابھی آپ جائیں۔ اسے میں دیکھ لوں گی۔"

ثانیہ اس کی ہم عمر تھی۔ اور اپنے بھائی کی طرح اس پر حق بھی جماتی تھی۔

ان دونوں نے الگ اسکول کالج میں تعلیم حاصل کی تھی مگر دوستی پھر بھی تھی۔

"ثانی! نہیں مجھے میک اپ نہیں پسند۔"

وہ کہتی رہی مگر ثانیہ نے اس کی ایک نہیں سنی۔ وہ بس اسے آنکھیں دکھا کر اپنی مرضی کرتی رہی۔ وہ بھی چپ ہو گئی۔

"واہ اب لگ رہی ہو، منگنی کے دن والی دلہن۔ تمہارے دولہا کے آئی مین ہونے والے دولہا کے ہوش ٹھکانے لگ جائیں گے۔"

وہ حیران ہوئی۔ امی نے ایسا کچھ تو نہیں کہا تھا۔ کہ منگنی ہو رہی ہے۔

ثانیہ نے اس کے بال کھول کر بڑا سا شیفون کا دوپٹہ اس کے سر پر اوڑھا دیا۔ وہ کچھ الجھ رہی تھی۔

"لیجیے اور داد دیجیے میرے میک اپ کی۔"

وہ اس کی خوب صورتی کو اپنے میک اپ کا کمال قرار دے رہی تھی۔

بھابھی نے بھی اسے سراہا۔

اس نے بھابھی کی ہدایت کے پیش نظر نظر جھکا رکھی تھی۔ بھابھی اور ثانیہ کے ہم راہ وہ سہج سہج چلتی بیٹھک میں آئی تھی۔

عارفہ نے اسے تھام کر صوفے پر بیٹھا دیا۔

"ماشاءاللہ! یہ تو بہت پیاری ہے۔"

شازمین کا پراشتیاق انگریزی لہجہ، اسے نگاہ اٹھانے پر مجبور کر گیا۔ نرم و نازک، سفید رنگت، بھوری آنکھیں، کندھوں تک لہراتے سنہری بال۔ متناسب سراپا۔ اس پر مستزاد اس کا خوب صورت لب ولہجہ۔ رقابت کا احساس تو نہیں مگر کچھ تو تھا۔

"مدد تو وہ اب بھی کر رہا ہے۔ بس وہ ہم درد ہی تھا میرا، اور میں پتا نہیں کس بات پر اکڑتی رہی؟" محبوب ہونے کا گمان، مغرور بھی تو کر دیتا ہے۔

اس نے سر جھکا لیا تھا۔

"تو بہن اجازت دیں۔ میں، انگوٹھی پہنا دوں قنوت کو۔"

آواز نعیمہ چچی کی تھی۔ اس نے جھٹکے سے سر اٹھایا۔

"امی! آپ نے پہلے بھی پہنائی تھی۔ یہ ہمارے بھائی کا حق ہے اب انہیں پہنانے دیں۔ کچھ یادگار تصویریں ہی بنالیں ہم۔"

عارفہ نے جھٹ موبائل کا کیمرہ آن کیا۔ جبکہ اس کے سامنے تو زمین آسمان گھومنے لگے تھے۔ وہ کس شان سے سفید کڑکڑاتے شلوار قمیض میں ملبوس اس کے پہلو میں آ بیٹھا تھا۔ مغرور، مسحور اور مسرور سا۔

"یہ سب کیا ہے؟"

وہ قنوت تھی۔ کیسے چپ رہ جاتی؟ وہ اسپرنگ کی طرح اٹھی تھی۔

"وہ ہی ہے جو طے تھا۔ بس ہم اس پر نیا تڑکا لگا رہے ہیں۔"

ثانیہ نے دانتوں کی نمائش کی۔ وہ امی کی طرف متوجہ تھی۔

"سب طے ہی تھا۔ کچھ نیا تو نہیں ہو رہا ہے۔"

"مگر میں ایک شادی شدہ مرد سے شادی نہیں کروں گی۔"

وہ چیخ کر بولی۔

اب دوسروں کے پہلو بدلنے کی باری تھی۔

"دوسری شادی، کس کی دوسری شادی؟"

عکراش کے لیے بالکل نئی اطلاع تھی۔

"عکراش فہیم صاحب! انجان مت بنیں۔ ایسی بے بس نہیں ہوں میں، جو دوسری بیوی بننا قبول کرلوں۔ آپ وہاں آرام سے پہلی بیوی کے ساتھ رہیں اور میں،"

اس نے بات قطع کر دی۔

"ایک منٹ، کس نے کہہ دیا تم سے میں پہلی شادی کر چکا ہوں؟"

اس نے پوچھا قنوت سے تھا مگر گھورا ثانیہ کو تھا۔

"آپ کے گھر والوں نے۔ امی! میں آپ پر بوجھ ہوں؟ آپ مجھے اس طرح سر سے اتار پھینکنا چاہتی ہیں؟"

وہ جذباتی ہو رہی تھی۔ جبکہ عکراش نے دانت پیسے تھے۔ شازمین بیچاری حیران و پریشان ہو رہی تھی۔

"آپ لوگ بتائیں گے کچھ؟"

عکراش نے خفگی سے ماں کی طرف دیکھا۔

"یہاں بیٹھو۔ بات دراصل یہ ہے کہ ہم نے تم دونوں سے جھوٹ بولا تھا۔ عکراش سے کہا تمہاری شادی ہو رہی ہے اور تم سے کہا عکراش شادی کر چکا ہے۔"

نعیمہ چچی نے پل میں عقدہ کھول دیا مگر وہ بے یقین تھی۔

کیوں؟ کا سوال ان دونوں کے چہروں پر کندا تھا۔

"تم دونوں ہی انا کے خول میں بند تھے۔ بس تم

دونوں کا ردعمل دیکھنے کے لیے ایسا کہا تھا اور تیر نشانے پر لگا۔ جو اگلے دس سال تک واپس آنے پر آمادہ نہیں تھا، وہ بھاگا چلا آیا اور جو ناپسندیدگی کا پرچار کرتی تھی وہ چھپ چھپ کر رونے لگی۔ رات رات بھر جاگنے لگی، اپنی سدھ بدھ کھونے لگی تھی۔ ہمیں تو یقین تھا کہ دونوں اب بھی ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ بس یہ یقین بڑوں کو دلانا تھا۔ خاص طور پر فہیم چچا اور قیوم کو جو اپنی لاڈلی کی مرضی کے خلاف کوئی فیصلہ نہیں کرنا چاہتے تھے۔ آخر اس بیل کو منڈھے بھی تو چڑھانا تھا۔"

بھابھی نے اپنے مخصوص شوخ انداز میں پوری روداد گوش گزار کردی تھی۔

"تو وہ شادی۔"

وہ منمنائی اور شازمین کی جانب دیکھا جو پورے قصے سے انجان تھی۔

شازمین عکراش کو اپنے بھائی حماد کی طرح سمجھتی تھی اور بڑے شوق سے اس کے ساتھ پاکستان گھومنے بھی چلی آئی تھی۔ گھر والوں نے بھی عکراش پر اعتماد کرتے ہوئے کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔

وہ لب دانتوں تلے دبائے ڈبڈبائی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"آئی ایم سوری! میری جس بات سے تم ہرٹ ہوئی تھیں اسے کہہ کر، میں بھی بہت پچھتایا تھا مگر اس وقت انا آڑے آگئی تھی۔ ابا نے جو کچھ تمہارے لیے کیا اس پر میرا کچھ کہنا بلا جواز تھا، کم ظرفی تھی۔ مگر تم میری مداخلت کو اپنی انسلٹ سمجھتی تھیں۔ میری نیک نیتی پر شک کرتی تھیں بس میں بھی کم ظرفی کا مظاہرہ کر گیا۔ معاف کردو مجھے۔"

وہ ساری سوئیاں جو اس کی روح میں پیوست تھیں کتنی نرمی سے نکل گئی تھیں۔ معافی وہ اسم ہے جو روح کے گھاؤ بھر سکتا ہے شرط یہ ہے کہ معافی مانگنے والے کی نیت صاف ہو۔

"اب معافی تلافی بھی ہوگئی۔ اب تو منگنی کی رسم کرنے دو۔" ثانیہ کو سب سے زیادہ عجلت تھی۔

"اگر اعتراض نہ ہو تو؟"

وہ شریر لہجے میں مخاطب ہوا تھا۔ انگوٹھی اس کے ہاتھ میں تھی، قنوت کا ہاتھ بھابھی نے کلائی سے پکڑ کر آگے کیا۔

"ایسے نہیں قنوت کی مرضی سے۔"

وہ بضد تھا۔ بھابھی نے کلائی چھوڑ دی۔ مگر قنوت نے ہاتھ پیچھے نہیں کیا۔

اس نے انگوٹھی قنوت کی انگلی میں پہنا دی تھی۔ ثانیہ اور عارفہ اور اس کے بھتیجوں نے تالیاں بجائی تھیں۔ مگر وہ سب سے بے نیاز دمکتے نگینوں والی انگوٹھی کو دیکھتی رہی تھی۔ یہ وہ ہی انگوٹھی تھی جو اس نے واپس کردی تھی مگر یہ اسی کا نصیب تھی۔ امی کے چہرے پر اطمینان تھا۔ نعیمہ چچی نے وہی کنگن اس کی کلائی میں پہنائے۔

"یہ تمہارے لیے ہی تھے۔"

اس کا چہرہ اندرونی خوشی سے دمکنے لگا تھا۔

سب کھانے کے بعد خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ قنوت اٹھ کر صحن میں آگئی۔

کھلے آسمان تلے اس نے گہری سانس لی۔

"کیا سوچ رہی ہو؟"

وہ اس کی آواز سن کر پلٹی تھی۔ وہ اطمینان سے سینے پر ہاتھ باندھے کچھ فاصلے پر ایستادہ تھا۔

"یہی کہ ایک اعتراف مجھے بھی کرنا چاہیے۔"

"تو دیر کیسی؟ کہو میں سن رہا ہوں۔"

وہ اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کے ارتکاز کے باوجود نگاہ نہیں ہٹائی تھی۔

"تم رعب جماتے اچھے نہیں لگتے۔"

وہ آپ سے پھر تم پر آگئی تھی۔

"چلو کوئی بات نہیں میں محبت جتاتا اور حق جماتا تمہیں ضرور اچھا لگوں گا۔"

بے اختیار قنوت کے چہرے پر مسکراہٹ در آئی تھی۔ عکراش فہیم بھی مسکرا دیا۔

☆☆